عشاق کے قافلے

19

میر عبدالعزیز کُرد

(3 جنوری 1924............5 نومبر 2010)

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

ضابطہ:

کتاب	:	میر عبدالعزیز کرد
مصنف	:	ڈاکٹر شاہ محمد مری
اشاعت	:	2016ء
قیمت	:	250/- روپے
ناشر	:	سنگت اکیڈمی آف سائنسز

اسٹاکسٹ:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ

فون: 081-2843358

ای میل: editor@sangatacademy.net

ویب سائٹ: www.sangatacademy.net

انتساب

اکابرین کے جمع کردہ جیل کے سیکڑوں برسوں
کے ایک ایک سسکاتے لمحے سے نفرت کے نام

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

فہرست

پیش لفظ	06
میر عبدالعزیز کرد	08
محمد امین کھوسہ	30
عبدالصمد خان اچکزئی	46
محمد حسین عنقا	73
قادر بخش نظامانی	84
آغا عبدالکریم	97
عبدالرحمان بگٹی	109
نسیم تلوی (ماسٹر پیر بخش)	118
محمد اسلم اچکزئی	121
ملک فیض محمد یوسف زئی	125

پیش لفظ

سولائزیشن کے جس مقام پہ ہم آج سانس لے رہے ہیں، وہ بے شمار پاک انسانوں کے قتل کردہ ارمانوں کے کندھوں پہ استوار ہے۔ یقین و شک کے جس سائنسی چوراہے پر ہم آج موجود ہیں یہ چوک، ایک ایک لمحہ گھٹ گھٹ کر جینے والے ہمارے باپ دادا کا عطا کردہ ہے۔ انہوں نے اچھا انسان بن جانے میں ہماری مددیوں کی کہ ہمارے ہاتھ میں سماجی سائنسز کا پرچم تھما دیا تھا۔ یہ لوگ مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے پیشے ایک سے نہ تھے۔ وہ مختلف زبانیں بولتے تھے۔ ان میں صرف دو باتیں مشترک تھیں:

1- انسانوں سے پیار

2- اِس پیار میں مستقل مزاجی

یہ الگ بات ہے کہ انسانوں سے یہ پیار انہیں بہت مہنگا پڑا۔ کسی کو 36 برس کی جیل ہو گئی، کوئی 32 سال جیل رہا۔ ایک کو ساہیوال کی قید ہوئی، کوئی مچھ جیل کے غیر انسانی ماحول میں جیا۔ ان کے بچے بے تربیت رہے۔ بیویاں اُن کے زندہ رہنے کے باوجود بیوائیں بنی رہیں، روٹی کی محتاج، پڑوسنوں کے طعنوں کی شکار۔ اُن کی زمینیں بن کاشت رہیں۔ اُن کے مویشی بن چرواہے کے دو پایہ اور چار پایہ، بھیڑیوں کی نذر ہوتے رہے۔

ہم اپنے بزرگوں کے بہت مقروض ہیں۔ مصروفِ شب و روز میں زندہ رہنے کے باوجود ہمارا نوجوان، اُن بڑے انسانوں اور تباہ کن مصائب کا شکار اُن کے بیوی بچوں ماؤں کو احترام سے

ضرور دیکھے گا............ میں نے یہ کتاب اسی لیے لکھی ہے۔

زندگی اور صحت کی بادشاہی موقع دے تو میں ان میں سے ہر بزرگ پر، اُس کی تعلیمات اور جدوجہد پر، اور اُس کے اہل وعیال کی شاشانی استقامت پر الگ الگ کتاب لکھنے کی اپنی ازلی ابدی خواہش پوری کرسکوں گا۔ ایسے سونے چاندی لوگوں کو تو انسانی ضمیر اور آزادیِ بشر کی سرآنکھوں پر رکھنا چاہیے!۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2016

شہری مراکز کی بلوچ سیاست کے موجد

میر عبدالعزیز کرد

(1969-1907)

''سرمایہ دارانہ نظام قوم وملت کے لیے ناسور کی حیثیت رکھتا ہے...... بلوچستان کے خانہ بدوش لوگوں کو چھت مہیا کرنا چاہیے ۔ روٹی اور تعلیم کا بندوبست ہو، اور ان کی صحت کا انتظام ہو''۔(1)

مستقبل کے بلوچ معاشرے کے بارے میں یہ خیالات بلوچ قوم کے بزرگ میرعبدالعزیز کرد کے تھے، جو اس نے نصف صدی پہلے کہتے تھے۔ انھی فقروں کی عصمت بچاتے بچاتے اوران دوفقروں کی ترویج کرتے کرتے بلوچوں کا یہ سفید ریش زندگی بِتا گیا۔ وہ اور اُس کے ساتھی انھی آدرشوں کے لیے مرمر کر جیتے رہے اور جی جی کر کام کرتے رہے۔ اُس کے بعد بھی بلوچ قوم کے اندر بے شمار سچے اور باشرف فلاسفر، دانش ور اور سیاست دان آئے۔ وہ سب بھی اپنے اپنے تجربوں اور اپنے اپنے حالات میں سے گزر کر اسی دونقاطی منشور پر پہنچے۔ اور یہی وہ کم سے کم نکات ہیں جن سے آج بھی ہر ایمان دار اور نیک نیت انسان متفق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ فقرے تو ہم نے یہاں پر دُہرا دیے ہیں لیکن ذرا سوچیے تو کہ جو حکومت یہ کام کر پائے گی، وہ کیسی ہوگی؟۔ ضیا، مشرف، زرداری اور نواز شریف کی سرپرستی میں چلنے والی حکومت یا پھر ایک

عوامی، انقلابی اور خود اختیار سرکار!۔

بلوچ سیاسی تحریک میں میر عبدالعزیز کرد کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ کرد صاحب وہ اولین شخص ہے، جس نے قبائلی معاشرے کے اندر سے ابھر آنے والے نومولود شہری مراکز کی اہمیت کو جانچ لیا تھا۔ اور اس طرح بلوچ تاریخ میں عبدالعزیز کرد وہ پہلا شخص ہے جس نے شہری مراکز کا اندازِ سیاست شروع کیا اور بلوچوں میں قرارداد و جلسہ کی جدوجہد متعارف و مروج کر دی۔ پمفلٹ، پوسٹر، اخبار، اور ہڑتال جیسی باتیں جو بلوچ سیاست میں بالکل نئی باتیں تھیں۔ ایسی حالت میں کہ پیر گھٹنوں گھٹنوں قبائلی سماج کے اندر پیوست تھے مگر، فکری و سیاسی ہل چل نیم قبائلی شہری مراکز میں ہوتی تھی۔ اس لیے میرا دعویٰ ہے کہ قبائلی طرزِ مزاحمت کی روایتی فضا میں ایک نئے داؤ پیچ کی بنیادیں ڈالنے والے میر عبدالعزیز کرد کا مقام بلوچ تاریخ میں کبھی بھی مدہم نہ ہو سکے گا۔

شہری سیاست کرنے کی ایک وجہ تو بلاشبہ اُس کی سیاسی دور اندیشی تھی۔ اور دوسری وجہ اُس کا اپنا خاندانی ماحول بھی تھا۔ عزیز کرد شہری مراکز میں روٹی روزگار حاصل کرنے والے ایک خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا والد میر ٹِلّنڑ خان ریاست قلات کا ملازمت پیشہ شخص تھا۔ عبدالعزیز 1907ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا آبائی علاقہ مستنگ تھا، جو خود ایک نیم شہری علاقہ تھا۔ وہ بلوچوں کے کُرد قبیلے کے مدّے زئی طائفہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ بالعموم شہری مراکز کے ارد گرد آباد تھا۔ اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ایک ایسا پس منظر رکھنے والا سیاسی ورکر' کس طرح کے میدان کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائے گا۔

عبدالعزیز ابھی پانچ برس کا تھا کہ 1912ء میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ تب والد نے عزیز اور اس کے چھوٹے بھائی غلام رسول کی تربیت خود کی۔ انہیں مستنگ کے انگلش ورنیکلر مڈل سکول میں داخل کر دیا۔ مگر وہ ابھی صرف بارہ برس کا تھا جب والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس بنا پر وہ مڈل کا امتحان نہ دے سکا۔ گویا اس کی روایتی اور باقاعدہ تعلیم پرائمری (یا بلوچی میں مَنّو مڈل) ہی رہی۔

لیکن ڈگریوں والی تعلیم پر بڑے انسانوں کا انحصار بھلا کب رہا ہے۔ دیگر بڑے

انسانوں کی طرح کرد صاحب نے بھی اپنی خود تعلیمی کا سلسلہ زندگی بھر جاری رکھا۔ اس نے مہاتما گاندھی، مصطفیٰ کمال پاشا اور غازی امان اللہ وغیرہ کی تحاریکِ آزادی کا بغور مطالعہ کیا اور سعدی' مولانا آزاد، غالب، بیدل، جامی، نظیری، حافظ اور اقبال کا کلام پڑھا۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ہمارے سارے سیاسی اکابرین میں یہ خصوصیات مشترک تھیں۔

میر عبدالعزیز کا والد میر ٹِلّنڑ خان خود بھی ایک آزاد منش بلوچ تھا۔ وہ ملازمت کے باوجود سیاسی خیالات رکھتا تھا۔ انگریزوں کے بھی خلاف تھا اور ان کے حلقہ بدوش سرداروں کے بھی۔ میر عبدالعزیز کرد گو کہ کم سنی میں اپنے اتالیق والد سے محروم ہو گیا مگر اس نے اپنے والد کے خیالات کو موروثی قرار دے کر اپنا لیا۔

شہری مراکز والی ہماری اس ابتدائی سیاست کے خدوخال بھی بہت دلچسپ ہیں۔ یہ سیاست ایران، ترکی، افغانستان اور روس میں جاری سیاسی اتھل پتھل، اور ہندوستان میں برطانیہ دشمن تحریک سے بہت متاثر رہی۔ پڑھے لکھے لوگوں میں یہ بلوچ قومی تحریک 1920ء میں معرضِ وجود میں آئی۔ ملحوظِ نظر رکھیے کہ بلوچ قومی تحریک کا یہ نیا جنم عظیم اکتوبر سوشلسٹ انقلاب کے محض تین سال بعد متشکل ہوتا ہے۔ کیا مضبوط پس منظر ہے جدید بلوچ سیاست کا!!

بلوچستان میں جمہوری انداز والی شہری سیاست کی داغ بیل ڈالنے والے اس اولین شخص (میر عبدالعزیز کرد) نے 1920ء میں ''ینگ بلوچ'' کے نام سے اپنی تنظیم قائم کی۔ یہی تنظیم ہماری سیاسی تحریک کا آغاز تھی۔ یہ تنظیم برطانوی سرکار کی ناک کے نیچے بنی تھی، اس لیے فطری طور پر اسے خفیہ ہی رہنا تھا۔ (2) اس تنظیم کا مقصد ملکی (مقامی) ملازموں کے حقوق کا تحفظ کروانا تھا جنہیں بہت حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے ملازمین بہت دبدبے اور برتری والے تھے۔ روزگار کی ساری سہولتیں بھی انھی نان لوکل خارجی لوگوں کے عزیزوں رشتہ داروں کو حاصل تھیں۔ یہ تو خیر میرے اپنے زمانے تک کی بات تھی کہ ناجائز طور پر بلوچستان کی نوکریاں ہتھیا لینے کے بعد شرمندگی کے بجائے یہ غیر مقامی لوگ سینہ تان کر ہمیں ہی حقارت سے دیکھتے تھے۔

بعد میں اس تنظیم کا نام بدل کر ''انجمن اتحادِ بلوچستان'' رکھا گیا اور اسے باقاعدہ سیاسی پارٹی کے بطور لیا گیا۔ اس پلیٹ فارم سے یہ انسان دوست افراد، عوام میں انگریز سامراج سے آزادی اور قومی یک جہتی کا شعور پہنچاتے رہے۔

یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان بھر میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک زبردست تحریک چل رہی تھی۔ بالخصوص کمیونسٹ پارٹی اور انڈین نیشنل کانگریس کی تحریکیں قومی جدوجہد کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ اور ان کے اثرات آس پاس کی قوموں پر پڑ رہے تھے۔ عوام الناس باشعور ہوتے جا رہے تھے۔ عوام کا یہ سیاسی شعور اس بات کا متقاضی تھا کہ ایک ایسی سیاسی پارٹی کی تشکیل ہو جو خود اپنی سرزمین کے مخصوص حالات کا ادراک رکھتی ہو۔ اور یوں وہ سامراج دشمنی کی جدوجہد میں عوام کی منظّم رہنمائی کرے۔

میر عبدالعزیز کو بھی آزادی کی خنک ہوا کی تلاش تھی۔ وہ ایک ایسی آواز سننے کو بے تاب تھا جو اُسے آزادیِ وطن کا پیغام دے، عزم و حوصلہ عطا کرے اور ایک باوقار انسانی حیات کی نوید دے۔ قدرت میرے رب کی' کہ اسی زمانے (1929ء) میں کرد صاحب کو ایک درویش منش، تعلیم یافتہ اور سامراج دشمن ساتھی ملا۔ اُس کے اس نئے ساتھی کا نام یوسف علی مگسی تھا۔ اچھی قسمت والوں کو ہی اچھے ساتھی ملا کرتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ نواب مگسی اپنے ڈھنگ سے اور اپنے نظریے کے مطابق سامراج دشمنی کرتے کرتے لاہور کے ایک اخبار تک رسائی پا گیا تھا۔ اس نے لاہور کے ایک اخبار ''مساوات'' میں (جسے ڈاکٹر محمد عالم چلاتا تھا) ریاست قلات کے اُس وقت کے جلادطبع وزیر اعظم شمس شاہ کے خلاف ایک زبردست مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا: ''فریادِ بلوچستان''۔ شمس شاہ گجرات، پنجاب کے ایک گاؤں پیر جٹاں کا رہنے والا تھا۔ وہ پہلے پٹواری بنا اور بعد میں انگریز نے اسے قلات کا وزیر اعظم بنا ڈالا۔

اُس زمانے میں سرکار مخالف مضمون لکھنا بہت بڑا جرم ہوتا تھا اور پھر شمس شاہ جیسے قہار و جبار حاکم کے خلاف لکھنا تو خاندان بھر کی تباہی کو دعوت دینا تھا۔ دانت پیس پیس کر شمس شاہ نے

مگسی کو مستنگ جیل بھجوا دیا، جہاں اس پر بڑی کڑی نگرانی رکھی جانے لگی اور بیرونی دنیا سے اس کے رابطوں پر سخت پابندی لگا دی گئی۔ مگر، خیالات' نظریات بھلا نظر آنے والے چیزیں ہوتی ہیں کیا؟۔ یہ تو بے پاؤں اور بغیر پر کے اور بغیر نقش ہائے پا چھوڑے چلتے ہیں۔ اور لگتا ہے جیسے انہیں کوئی سپرنگ لگے ہوں۔ آپ جتنا دباؤ میں رکھیں گے وہ اتنی ہی زور سے ردِعمل دیتے ہیں۔ اور یہاں تو خیالات و نظریات کا مالک عبدالعزیز خود ایک چھلاوہ انسان تھا۔ اُس نے جب یہ خدائی مدد دیکھی تو لپک کر اسے حاصل کرنا چاہا۔ کرد صاحب نے کمال مہارت اور رازداری سے نواب یوسف علی خان سے رابطہ پیدا کیا۔ اور قلات تحصیل کے نائب کے توسط سے مگسی صاحب کو اپنی پارٹی کی دستاویزات' انجمن کا دستور اور دیگر لٹریچر خفیہ طور پر بھجوا دیا۔ اُس کے ساتھ بلوچستان کی غلامی، اور عوام کی پست معاشی سماجی حالت پر بحث مباحثے کیے اور اسے اپنی تحریک اور اس کے مقاصد کے بارے میں آگاہ کیا۔ سامراج دشمن یوسف فوراً ہی اس سے متفق ہو گیا۔

نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ وضاحتیں ہوتی رہیں، اتفاق بنتا گیا تا آنکہ مگسی صاحب نے باقاعدہ تحریک سے وابستگی اختیار کی۔(3)

یوسف مگسی اُس تحریک کا ممبر بن گیا جس کے کارکنوں کو اپنے کاز کے ساتھ اس قدر اخلاص تھا کہ اُن میں سے ہر ایک نے سورہ یٰسین پر دستخط کر کے اس کے منشور کا پابند رہنے کا حلف اُٹھا رکھا تھا۔(4)۔ مگسی صاحب کے آن ملنے سے بلوچستان کی اس پہلی باضابطہ سیاسی پارٹی کے قیام کا برملا اعلان کیا گیا اور اس کے لیے بارہ رکنی مجلسِ عاملہ کا انتخاب بھی عمل میں لایا گیا۔(5)

یہ وہی دور ہے جب وزیر اعظم قلات، شمس شاہ نے علاقہ جھل مگسی کا کنٹرول براہِ راست ریاست قلات کے اختیار میں لے لیا اور منشی مہمان سنگھ نائب تحصیل دار کو وہاں کا انچارج بنا دیا۔ مطلب یہ کہ وہ خود ہی بادشاہ بن گیا۔ سیاہ و سفید کا مالک۔ یوں، ناروا جبر اور ظلم کے لیے اس کے سارے راستے کھل گئے۔

وزیر اعظم شمس شاہ کا جبر بلا روک ٹوک، بلا مزاحمت جاری تھا۔ پہلی بار انجمن نے ان چیرہ دستیوں کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں نواب یوسف عزیز

مگسی اور میر عبدالعزیز کرد لاہور گئے اور وہاں اُن دونوں کے دستخطوں سے ''شمس گردی'' کے نام سے ایک پمفلٹ شائع ہو کر بلوچستان پہنچا۔ ایک آگ لگ گئی شمس شاہ اور اس کے حواریوں کے کیمپ میں!!۔ ڈکٹیٹر تو پمفلٹ سے ایسے ڈرتا ہے جیسے یہ اُس کی موت کا پروانہ ہو۔ بلوچ تاریخ میں یہ اولین سیاسی تحریروں میں سے ایک ہے، جس کا لہجہ کچھ یوں ہے:

''قدیم رواج کی رو سے یہ عام جمہوری رعایا کا مسلمہ حق ہے کہ وہ اپنا فرماں روا خود منتخب کرے۔ بلوچ اپنے اِس حق سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اس لیے برٹش حکومت کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کراتے ہوئے اپیل کی جاتی ہے کہ براہِ مہربانی رعایا کے اس حق کو شمس شاہ کی ذاتی خواہشات پر قربان نہ کیا جائے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انتخاب جانشینِ تختِ قلات کا مسئلہ حل کرنے کے لیے چند سرداروں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب تک سر شمس شاہ برسر اقتدار رہے' اُس وقت تک سردار اُس سے ڈرتے ہیں اور اس سے بیزار اور تنگ ہونے کے باوجود اس کی مخالفت نہیں کر سکتے...... لیکن ہم یہ واضح کیے دیتے ہیں کہ سرداروں کا ایسا کوئی انتخاب صحیح تسلیم نہیں کیا جائے گا جو اپنے ملک کی روایات کو پس پشت ڈال کر' اپنے ان قبائل کے صلاح مشورے کے بغیر، کریں گے جن کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں۔

''واضح رہے کہ ریاست قلات کی عام رعایا کوئی ایسا حکمران نہیں چاہتی جو وزیر اعظم کا دست نگر بن کر خالی تخت کو برائے نام پُر کرے اور جس کو رعایا اور ملک کی بہبود سے سروکار نہ ہو۔ ہم ایسا حکمران چاہتے ہیں جو تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے دستوری اور ذمہ دار حکومت کا اعلان کر کے جمہوری رعایا کے منتخب نمائندگان کی ایک اسمبلی قائم کرے جس کی ایک باضابطہ کابینہ وزارت ہو''۔(6)

انجمن اُس بے اختیار اور کٹھ پتلی خان سے نجات (انسان بھی بہت دلچسپ مخلوق ہے۔ اپنے اوپر حاکموں کی تلاش کرتا رہتا ہے!!)۔ چاہتی تھی۔ اور واقعتاً ایک با اختیار اور نسبتاً ایک جمہوری خان کے تقرر کی جدوجہد کر رہی تھی۔ (انسان بھی بہت دلچسپ مخلوق ہے، تلاش کر کر کے بھرتی کرتا ہے اپنے اوپر حاکموں، حکمرانوں، آقاؤں، دیوتاؤں کو!!)۔ اُس وقت میر محمد اعظم خان ہی بہتر

انتخاب تھا۔ چنانچہ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انجمن خان قلات کی حیثیت سے میر محمد اعظم جان کی تقرری کی تحریک چلا رہی تھی۔ ایک منظّم تحریک جسے واقعتاً عوام الناس کی حمایت حاصل تھی۔ بالآخر اس جدوجہد میں اُسے کامیابی حاصل ہوئی اور 10 دسمبر 1931ء کو محمد اعظم خانِ قلات بن گیا۔ یہ بقول عنایت اللہ بلوچ: ''بلوچ معاشرے میں جدید جمہوری دور کی پہلی فتح اور برطانوی حکومت کا بلوچستان میں پہلا نقصان تھا''۔(7) کسی سیاسی تحریک کی اولین فتح کس قدر پرمسرت ہو گی!!۔ ایک اعتماد بخشنے والی فتح۔

چنانچہ ریاست بھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تخت پر بیٹھتے ہی اعظم جان نے سر شمس شاہ کو برطرف کر دیا۔ خان نے اُس کی جگہ خان بہادر گل محمد کو نواب کا خطاب دے کر وزیر اعظم قلات مقرر کر دیا۔(8) (خطابات لینا، خطابات دینا بادشاہوں کی ازلی! ابدی ضرورت بھی رہی ہے اور ازلی مشغلہ بھی!!)۔ لگتا ہے شمس شاہ کی برطرفی والی یہی ایک بات نئے خان اور انجمن کے درمیان مشترک تھی۔ اس لیے کہ خان نے باقی معاملوں پر انجمن کے عہدیداروں سے مذاکرات تو کیے مگر ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ میر عبدالعزیز کرد (جو کہ انجمن کا روح رواں اور ''شمس گردی'' کا خالق تھا) بھی جب محمد اعظم جان خان قلات سے ملا' تو اس نے اس کی عزت کرنے کے بجائے اس کی حرکتوں کو'' نا قابلِ برداشت'' ٹھہرایا۔ (ایسے ہوتے ہیں حکمران!)۔ مگر اس عبرت سے انجمنِ اتحاد بلوچاں کا بعد کا تسلسل کوئی سبق حاصل نہ کر سکا۔ ہم آج بھی کسی خان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اِس سردار سے چھٹکارا پا کر ہم اُس دوسرے سردار کو آزمانے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ یوں نسل در نسل ہم سرداروں کو اپنے کندھے پہ بٹھا بٹھا کر کسی اچھے سوار کے ملنے کی توقع رکھتے ہیں۔

کرد صاحب نے (جو انجمن کا سیکرٹری جنرل تھا) لاہور کے روزنامہ ''آزاد'' میں سیاسی مضامین کا ایک سلسلہ لکھنا شروع کر دیا۔ ان مضامین میں آزادی کی امنگ بھی تھی اور انگریزوں کے ظلم اور زیادتیوں کی داستان بھی۔ یہاں وہ ریاست کے اصل حالات کے بارے میں عوام کو مطلع بھی کرتا رہا۔ اور اس نے عوام سے اپنے حقوق کی خاطر اٹھ کھڑے ہونے کی اپیلیں بھی کیں۔ اسی

طرح اس کے ان مضامین میں ریاست قلات کے اندر عوام کے منتخب نمائندوں کی اسمبلی کے قیام کے مطالبات بھی شامل تھے۔تمام مستجار علاقوں (بولان، کوئٹہ،نوشکی اور نصیر آباد) پر برطانوی حکمرانی کے خاتمے اور انہیں ریاست میں دوبارہ شامل کرنے کے مطالبات تھے۔اسی طرح اس کے مضامین کے اندر لسبیلہ، خاران، اور مری بگٹی کے علاقوں کو ریاست قلات میں دوبارہ شامل کرنے کے مطالبات شامل ہوا کرتے تھے۔ میر عبدالعزیز کے یہ مضامین انتہائی مدلل، سبق آموز، مواد کے اعتبار سے جامع اور لہجہ کے لحاظ سے زوردار ہوا کرتے تھے۔کہتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے میر صاحب کے ایک مضمون کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے احباب سے دریافت کیا:''کیا کسی کو معلوم ہے کہ میر عبدالعزیز کرد کس یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہے؟''۔(9)

9 ستمبر 1932ء میں انجمن کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے کرد صاحب نے ''زمیندار'' رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:''میں نے ہندوستان سے علیحدہ بلوچستان کا نظریہ پیش کیا ہے اور یہ تخیل آج کا نہیں بلکہ بارہ برس قبل 1920ء کا ہے۔اس وقت میں نے کہا تھا کہ میں بلوچستان میں ایک آئینی حکومت چاہتا ہوں جو ہر لحاظ سے آزاد ہو''۔(10)

یوسف عزیز مگسی اور عبدالعزیز کرد کی ولولہ انگیز قیادت اور ان تھک محنت کے نتیجے میں دسمبر 1932ء میں جیکب آباد میں ایک ''بلوچستان اینڈ آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' منعقد کرنے کا انتظام کیا گیا۔ یہ کانفرنس تین دن تک جاری رہی، جس میں بلوچستان میں اصلاحات کرنے' اور، ایک ذمہ دار اور آزاد حکومت کے قیام کے مطالبات کی منظوری دی گئی اور کانفرنس کے مطالبات کو برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ اگلے سال (نومبر 1933ء) ایسی ہی ایک کانفرنس حیدرآباد میں کی گئی۔

جلد ہی انگریز سرکار میر عبدالعزیز کے مضامین، اور اُس کی سیاسی سرگرمیوں سے خوف زدہ ہوگئی۔ اِس سب کا تدارک ضروری ٹھہرا۔چنانچہ جنوری 1934ء کو کرد کو گرفتار کرلیا گیا۔ جرگہ سسٹم موجود تھا۔اس ''ہر مرض کا علاج'' سے کسی بھی ناپسندیدہ شخص کو سزا دلوانا انتہائی آسان بات تھی۔ چنانچہ طلب کیا گیا شاہی جرگے کا اجلاس' اور میر عبدالعزیز کرد کو ہوگئی تین برس کی قید۔مگر وہ

بھی خالص قید نہیں بلکہ قید با مشقت!۔جرم کیا؟ اخبار میں لکھنا۔(پتہ نہیں لوگ انگریز کی کس صفت کی بنا پر اب بھی اس کی تعریفیں کرتے ہیں!!۔اور اُس سے بھی دلچسپ یہ کہ پرانے لوگ انگریز کی تعریف میں بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں مگر اُس کے عدالتی نظام پر بالکل خاموش رہتے ہیں، جس کے تحت سیاسی فیصلے اُن فیصلوں سے بہت کم معیار کے' اور جانب دارانہ تھے جن کی وجہ سے بعد میں پاکستان کا عدالتی نظام مذاق کا نشانہ بنا ہوا ہے)۔مولانا ابوالکلام صاحب کی یہ بات کس قدر برمحل لگتی ہے کہ ''تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے میدانوں میں ہوئی ہیں......''۔مگر یہ عدالت تو عدالت بھی نہ تھی بلکہ انگریزی استعمار کے چند پٹھو سرداروں پر مشتمل تھی۔اس پورے دور میں ان ''عدالتوں'' میں ایک بھی فیصلہ ایسا نہ ہوا جو انگریز حاکموں کی منشاء کے خلاف ہو۔

چنانچہ اس پڑھے لکھے اور جمہوری سیاست کرنے والے انسان کو مچھ جیل بھجوا دیا گیا۔

مگر یہ اقدام تو انگریز کا تھا جو قبضہ گر تھا، استعمار تھا۔اُس کے مقابلے میں آزادی پسندی تھی، روشن فکری تھی، وطن کی سرفرازی تھی۔اتنا بڑا تضاد صرف تین برس جیل سے بھلا کیا ختم ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گرفتاری کے وقت اُس کے مدمقابل کرد صاحب نے پارٹی کے نام جو پیغام دیا، اُسے چبا چبا کر پڑھنے کی ضرورت ہے:

''ساتھیو! آپ کو بلوچستان میں برطانوی پوزیشن خوب معلوم ہے۔اسے ہندوستانی سیاست کے پس منظر میں نہ دیکھئے۔

''..........بلوچ قوم کو افغان، انڈیا' یا کسی خارجی سیاست کی نقل نہیں کرنی چاہیے۔ برطانیہ نے نہ تو آپ کے ملک کو فتح کیا ہے نہ ہی اسے کسی سے خریدا ہے۔اس لیے آپ اس کے غلام نہیں ہیں۔اور وہ آپ کا آقا نہیں ہے۔ دراصل برطانیہ نے آپ کے ملک میں دوستانہ اور برابری کی بنیاد پر سمجھوتوں کے ذریعے تاجروں والی خصوصی رعایتیں حاصل کی ہیں۔اس لیے آپ کو ہمیشہ اپنی اصلی حیثیت اور سیاسی وقار کا احساس رہنا چاہیے......''

اور یہی بات ہمارے دانش وروں اور مؤرخوں کو یاد نہیں رہتی۔سہل پرستی میں ہم یا تو

افغان تاریخ سے خود کو جوڑتے ہیں یا پھر انڈیا کی تاریخ سے ۔قلم کاروں کی اِسی ایک لغزش نے کتنا نقصان پہنچایا تحریک کو، تاریخ کو، اور اکیڈیمکس کو!!

ان باتوں کو گرہ میں باندھ لینا چاہیے اس لیے کہ یہ محض تخیل کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے سیاسی اکابرین کی کٹھن سیاسی جدوجہد کا نچوڑ ہیں۔ بہر حال کرد جیل، اچکزئی جیل۔ مچ جیل!

جیل بہہ جائے نکل جائیں اچکزئی اور کرد
اشک کے سیلاب میں کچھ ایسا طغیاں چاہیے

مگر اِدھر وقت، ایک تباہ کن پلٹا کھاتا ہے۔1935ء کے خون آشام، اور سیاہ بخت زلزلہ نے کُرد صاحب پر مصیبت کا پہاڑ گرا دیا۔ یہ بد بخت زلزلہ اُس کے دست و بازو، توڑ دیتا ہے......وہ یوں کہ زلزلہ بلوچ عوام بالخصوص مزدوروں کسانوں کے نجات دہندہ یوسف علی خان مگسی کو کھا گیا۔اتنے بڑے انسان' مورچہ کے کامریڈ' اور گہرے دوست کی الم ناک و بے وقت موت ایک 'قحط الرجال' والے علاقے اور عہد میں تحریک کے اراکین پر جو غم و رنج برپا کر سکتی ہے اُس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے......مگر کرد صاحب پر تو یہ غم اور بھی شدید تھا۔اس لیے کہ وہ نہ تو رو سکتا تھا، نہ پسماندگان سے مل سکتا تھا اور نہ جنازے کو کندھا دے سکتا تھا...... وہ تو اپنے ایک اور ساتھی، اور ہمارے محترم رہنما جناب عبدالصمد خان اچکزئی کے ہم راہ اغیار کے حکم اور اپنوں کی غداری کی وجہ سے جیل میں بند تھا۔بس غم کا پہاڑ تھا اور ایک بہادر دل تھا۔دل' جو کبھی دیکھو تو معمولی کنکر سے کرچی کرچی ہو جاتا ہے اور کبھی دیکھو تو پہاڑ کے نیچے دب جانے کے باوجود ترانے گاتا جاتا ہے۔

آزادی کا یہ متوالا 1936ء میں اپنی اسیری کی معیاد پورے کرنے اور ایک مردِ مجاہد (جناب عبدالعزیز دہوار) کی جانب سے پچاس ہزار روپے کی مطلوبہ ضمانت داخل کرانے کے بعد رہا ہو کر مستنگ پہنچتا ہے۔مگر ہم ایک ہی فقرے میں بامشقت تین برس کو نمٹا نہیں سکتے۔جیل، اور وہ بھی انگریز کا جیل جہاں کوئی ٹی وی' کوئی اخبار' کوئی میل ملاقات' اور کوئی ای میل، ایس ایم ایس نہ تھے۔تین برس یعنی ایک ہزار پچانوے دن! بھائی، آزادی ایک ٹائپ رائٹر سے نہیں ملی تھی۔ہلکی باتیں نہ کرو۔

میر عبدالعزیز کرد اپنے دور کی سیاست پہ گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔اردگرد کیا ہو رہا تھا' کون کیا کر رہا تھا......اُس کی معلومات ہر دم تازہ رہتی تھیں۔اس زمانے میں برصغیر کے اندر علامہ اقبال اور اُس کے ہم فکروں کی (ایک حد تک) سامراج دشمن اور پین اسلام ازم والی شاعری کا بول بالا تھا۔میر عبدالعزیز کرد ہمارے دوسرے بزرگوں کی طرح علامہ اقبال سے بہت متاثر تھا۔وہ دوبار اُس سے ملنے لاہور گیا۔پہلی بار اپنے محبوب شاعر سے اِن عقیدت مندوں کے احترام و جذبات بھری محفل' 1933ء میں سجی تھی۔یہ ملاقات دو گھنٹے تک جاری رہی۔بقول کرد صاحب''میں سال 1933ء کے موسمِ برشگال میں اپنے رفیق محمد حسین عنقا کے ساتھ حضرت اقبال کی بارگاہ میں پہنچا۔آپ میکلوڈ روڈ میں قیام فرما تھے''(11)۔کرد صاحب نے اسے بلوچستان میں اپنی سیاسی تحریک کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔اس نے علامہ کو بتایا کہ ایک سال سے نواب یوسف علی خان مگسی کی رہنمائی میں چند قوم پرست نوجوانوں نے بلوچستان میں اصلاح و ترقی کی تحریک شروع کر رکھی ہے۔اور حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ بلوچستان میں آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں اور اسے خود اختیاری کا درجہ دیا جائے۔اس نے علامہ کو بتایا کہ انگریزی حکومت کے کارندوں نے مطالبات ماننے کی بجائے الٹا تحریکی لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ان کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کر دی ہیں۔انہیں اپنے ملک کے اندر اخبارات جاری کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔جلسوں اور تقریروں پر سخت پابندیاں عائد ہیں۔اس نے علامہ کو بتایا کہ وہ اور اس کے رفیق ہندوستان کے اندر اخبارات اور لیڈروں کی ہمدردی حاصل کرنے نکلے ہیں اور چند دنوں سے لاہور میں ہیں۔متعدد اخبارات کے ایڈیٹروں سے ملے ہیں۔ان کو حالات سے آگاہ کیا ہے اور آج آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے تا کہ زیارت کا شرف حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے لیے آپ کی ہمدردی بھی حاصل کریں۔

''میرے رفیق مسٹر محمد حسین عنقا نے سرداروں کی جہالت، جرگہ کے مظالم، اور بلوچستان کے طریقۂ تعلیم کے نقائص واضح کیے۔''(12)

علامہ نے انہیں دنیا کی تحاریکِ آزادی، سامراجی خصلتوں اور ہتھکنڈوں کے علاوہ اپنی

شاعری کے بارے میں بتایا۔ علامہ نے کہا، ''تم بلوچوں کو چاہیے کہ سائنس سیکھو۔ اپنے قدرتی خزانوں (یعنی معدنیات) کو ہاتھ سے نہ جانے دو، اور ان کو اغیار وا جانب کے تصرف سے آزاد رکھنے کی کوشش کرو۔ اگر حالات نے تمہارا ساتھ دیا اور تم لوگ ان قدرتی نعمتوں سے مستفید ہو سکے تو بلوچستان کسی زمانے میں ایسی ترقی کر جائے گا جس کا آج تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' (13)۔ (''ہمارے'' اِس اقبال کو ٹی وی ریڈیو پر غلط استعمال کرنے والے بعد کے حکمرانوں کو اللہ سزا دے گا)۔

علامہ اقبال سے میر عبدالعزیز کرد کی دوسری ملاقات تین برس بعد 1936ء کے اواخر میں ہوئی۔ علامہ نے اپنی مشہور نظم ''بوڑھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو'' دیگر عوامل کے علاوہ میر صاحب کی بار بار کی درخواستوں کے نتیجے میں لکھی۔ (14)۔ جس کے چند مصرعے یہ ہیں:

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
اللہ کو پا مردیِ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
توفیقِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بہ تو اندازِ گدارا
تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

الغرض، کرد 1936ء میں اپنے تین سال مشقت والی قید پورا کاٹنے کے بعد رہا ہوا تو پھر سیاست میں لگ گیا۔ وہ سبی چلا گیا۔ وہاں دوست احباب سے ملاقاتیں کیں۔ وہاں آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کیا گیا، اس لیے کہ ''انجمن اتحادِ بلوچاں'' تقریباً ختم ہو چلا تھا۔ ساتھی بکھر گئے تھے اور حالات بھی اس قدر بدل گئے تھے کہ نئے نام اور واضح اغراض و مقاصد کی حامل ایک باقاعدہ سیاسی پارٹی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ خوب بحث مباحثے ہوئے۔ صلاح مشورے ہوئے اور اس کے بعد انجمن کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے نئے حالات و شرائط کے مطابق عوام کی رہنمائی اور اسے پلیٹ فارم دینے کی غرض سے 5 فروری 1937ء کو ایک نئی پارٹی تشکیل دی گئی۔ اس کا نام ''قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی'' رکھا گیا۔ (یہی لفظ ''نیشنل'' بعد میں بلوچستان کی ہر پارٹی کے ساتھ نتھی رکھا گیا۔ یہ گویا اِسی ''ماں پارٹی'' کے ساتھ اپنی وراثت کا اظہار رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے)۔ میر عبدالعزیز کرد اس پارٹی کا صدر منتخب ہو گیا جب کہ میر گل خان نصیر نائب صدر اور ملک فیض محمد یوسف زئی سیکرٹری جنرل بنا دیے گئے۔ اس پارٹی کے منشور میں (جو یکم اپریل 1937ء کو تیار ہوا) آزادیٔ وطن کو پہلی اہمیت دی گئی۔ ظاہر ہے کہ دوسری بڑی اہمیت سرداری نظام کے خاتمے کو حاصل ہوئی۔ ہمارے اُس زمانے کے ان اکابرین کی تقریباً ہر تقریر اور تحریر میں سرداری نظام کی مخالفت موجود ہوتی تھی، اور ریاستِ قلات میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کے مطالبات شامل ہوتے تھے۔ اس لیے کہ شخصی حکومت اور جمہوری نظام میں ازل سے دشمنی موجود ہے۔ شخصی حکومت کا دوام جمہوری اداروں کی ترویج کو ناممکن بنا کر رکھ دیتا ہے۔ جب کہ جمہوری ادارے شخصی حکومت کے فنا ہونے کے بعد ہی متعارف ہو سکتے ہیں۔ عوام کو جواب دہ نہ ہونے والی حکومت میں عقلیت پسندی، علم و دانش اور ترقی وارتقا جیسی حسین نعمتوں کا گزر، ناممکن ہوتا ہے۔ خرافات اور توہمات کے سیاہ بادل عوام کے دلوں دماغوں کو تاریک کر دیتے ہیں جن سے عوام الناس پہ بزدلی اور کم ہمتی کا نامبارک مینہ برستا رہتا ہے۔

قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی نے اسی مکروہ نظام کے خاتمے کے لیے اپنا مقدس مشن جاری رکھا۔ پارٹی کا مقابلہ بہ یک وقت برطانوی استعمار سے بھی تھا اور سرداروں سے بھی۔ برطانیہ والے

اس پارٹی کو آزادی کا ترجمان سمجھتے تھے تو سرداراس پارٹی کو جمہوری اداروں کا معمار گردانتے تھے۔ لہٰذااس پارٹی سے دونوں کے وجود کو خطرہ تھا۔

پارٹی نے مندرجہ ذیل باتیں پروگرام میں رکھیں:

1۔ تمام انسانوں کا خون بہامساوی ہو۔

2۔ زرشاہی اورزرسرنامی ٹیکس جوسرداروں کی طرف سے لی جاتی تھیں، بند ہوں۔

3۔ بے گاربند ہو۔

4۔ مالی، پرس اور بجار جوسرداروں کے ٹیکس بن چکے تھے، بند ہوں۔

بلوچ دانش ور' اور سیاسی ورکر پارٹی کے اِس پروگرام سے اچھے خاصے متاثر ہوئے۔ دراصل سرکاری ملازمین اس پارٹی کا اہم اثاثہ تھے۔اور یہ بات ہر دور میں بلوچ سیاست کے اندر موجود رہی ہے۔تقریباً سارے پڑھے لکھے لوگ چھوٹی موٹی ملازمتوں میں رہے۔اس لیے بلوچ سیاسی تاریخ میں تمام سیاسی پارٹیاں سرکاری ملازموں کے مرکزے کے گرد چلتی رہیں...... گوکہ بظاہر' سرکاری نوکر پہ سیاست کرنا ممنوع رہا ہے۔

کردصاحب کی پارٹی نے قبیلوں کے اہم لوگوں کو اپنے ساتھ ملالیا اوراس طرح دانش وروں، سرکاری ملازمین اور قبائلی لوگوں نے پارٹی کو مضبوط بنایا اور یہ پارٹی' ایک عوامی پارٹی بن گئی۔ جب کہ سردار، فیوڈل اور برطانیہ کی حکومت پارٹی کے ازلی طبقاتی دشمن تھے۔ اکتوبر 1937ء میں پارٹی کے رہنما میر محمد حسین عنقانے بلوچی میں پہلا قومی نغمہ چھاپا۔1937ء تک کراچی سے یکے بعد دیگرے ینگ بلوچستان، کلمۃ الحق، آفتاب، نجات، حقیقتِ بلوچستان اور بولان کے نام سے صحیفوں کا اجرا ہوا۔ پارٹی نے حتی الوسعی خان کو ناراض کرنے کا کوئی موقع نہ دیا مگر خان تو بہر حال ملک کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ تو سردار کو زیادہ ناراض کرسکتا تھا، نہ فیوڈل کو اور نہ ہی برطانوی سامراج کو............اس کا تخت انھی قوتوں کے سہارے جو قائم تھا۔

اِن اچھے لوگوں نے اپنی تحریک جاری رکھی۔ کسی آندھی طوفان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، کسی موقع پرستی کا شکار نہ ہوتے ہوئے یہ لوگ اپنے مقصد میں لگے رہے۔ نتیجہ؟۔ نتیجہ یہ کہ نیشنل

پارٹی اپنے اکثر مطالبات منوانے میں کامیاب ہوگئی۔ان کی فہرست یوں ہے:

1۔**مساوی عوضانہ خون** :۔ بلوچستان کے قبائلی رسم ورواج کے مطابق جت، نقیب، درزادہ، غلام، ڈومب اور مرہٹہ لوگوں کا خون بہا دوسرے بلوچ باشندوں کی بہ نسبت بہت کم تھا۔ آپس کی لڑائی میں اگرایک طرف سے ایک اصیل بلوچ مارا جاتا اور دوسری طرف سے تین جٹ یا نقیب وغیرہ مارے جاتے، تب بھی جت یا نقیب کو مزید چار پانچ سو روپے بلوچ مقتول کے ورثا کو بطور عوضانہ دینے پڑتے تھے۔ عموماً پانچ جت یا اسی سماجی مرتبہ کے دیگر پانچ باشندوں کا عوضانہ ایک اصیل بلوچ باشندے کے عوضانہِ خون کے برابر ہوتا تھا۔

نیشنل پارٹی بنیادی طور پر عوضانہِ خون لے کر' اور قاتل کو قید کی سنگین سزا دیے بغیر رہا کرنے کے خلاف تھی۔ لیکن پہلے قدم کے طور پر پارٹی نے ریاست قلات کے تمام باشندوں کے لیے بلا لحاظِ قبائل وسماجی مرتبہ ونسب' مساویانہ عوضانہ وجرمانہ خون مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ایک متفقہ قرارداد میں خانِ قلات وارکینِ اسٹیٹ کونسل سے ریاست کے تمام باشندوں کے لیے بلالحاظ قبائل وسماجی مرتبہ ونسب مساوی خون بہا مقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ریاست کے تمام بڑے شہروں میں (جواس وقت بھاگ، لہڑی، ڈھاڈر، مستنگ، خضدار، پنجگور اور تربت تھے) جلسوں کا انتظام کیا گیا۔ بڑے بڑے جلوس نکالے گئے اور مقامی جرگوں کے سامنے مظاہرے کیے گیے۔

گل خان نصیر جیسا ہمارا بڑا شاعر ان ناروا ٹیکسوں کے خلاف دھاڑ رہا تھا چنگھاڑ رہا تھا۔ اردو میں دیکھیے:

کریں برباد وہ ہم کو زرِ شاہ اور زرِ سر سے
یہ ظلمِ ناروا کب تک یہ قہرِ آسماں کب تک
بمثلِ جونک سرداروں نے ہم کو چوس رکھا ہے
الٰہی رنگ لائے گی یہ خونِ بے زباں کب تک

فارسی میں دیکھیے ہمارا گل خان کیا کہتا ہے:

جرگہ و بجار و مالی و کلنگ
ایں ہمہ در تاک چوں شیر و پلنگ
می برند عقل و دل و جانِ بلوچ
می رباہند دین و ایمانِ بلوچ
ایں ہمہ گرگ اندو ما چوں گوسفند
لاغر و بے جان و ترسان و نژند

الغرض نیشنل پارٹی کے اس مطالبے کی پشت پر ریاست قلات کی آدھی سے زیادہ آبادی کھڑی تھی۔ اس لیے مجبوراً سٹیٹ کونسل نے اس مطالبے کو متفقہ طور پر منظور کرنے، اور ریاست کے تمام باشندوں کے لیے مساوی عوضانہ خون مقرر کرنے کا فیصلہ کر دیا۔

2۔**زر سر اور زرشاہ کی معافی** :۔خان قلات کی حکومت اور کچکی سردار مکران کے باشندوں سے ''زرِسر'' اور ''زرِشاہ'' کے نام سے ایک سالانہ ٹیکس لیتے تھے۔ ہر مرد، عورت، بچہ یا بوڑھا سب سے دو آنے فی کس زرِسر اور دو آنے فی کس زرِشاہ کے نام سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس طرح وصول کی ہوئی کل رقم کا نصف حصہ خان قلات کو اور نصف حصہ کچکی سرداروں کو ملتا تھا۔ نیشنل پارٹی نے خان قلات کے دورہِ مکران کے موقع پر اس ٹیکس کو ناجائز قرار دے کر اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔ مکران کے عوام نے پارٹی کی آواز پر لبیک کہا۔ چنانچہ جب خان قلات تربت پہنچا تو حاجی عبدالسلام صدر نیشنل پارٹی مکران برانچ کی راہنمائی میں دو تین ہزار لوگوں نے اس کی قیام گاہ کے سامنے پُرامن مظاہرہ کیا اور پارٹی کے تین نوجوان ممبروں نے دو دن تک بھوک ہڑتال کی۔ خانِ قلات کو اسی مقام پر نصف حصہ کے مالک کچکی سرداروں کی رضامندی سے زرِسر اور زرِشاہ کے ناجائز ٹیکس کی منسوخی کا فرمان جاری کرنا پڑا۔

3۔**بیگار کی بندش** :۔ریاست قلات میں حکومت کے کارندے غیر قبائلی عوام یعنی ریاست کے مالیہ دینے والے طبقہ سے مفت جبری محنت یعنی بیگار لیا کرتے تھے۔ حکم تھا کہ خود بھی کام کرو، اوپر سے اپنا اونٹ یا بیل بھی بیگار میں دے دو۔ کئی کئی دن تک ان جانوروں سے

مشقت لی جاتی تھی۔ بے پرواہ حاکم کو اس سے کیا مطلب کہ جانور کو کچھ کھلانا بھی ہے، اُسے کچھ پلانا بھی ہے۔ جو انسانوں کے ساتھ ناترسی کرتے ہیں وہ جانوروں پر کیا ترس کھائیں گے۔ مشقت کے دوران بے دردی سے جانور کو پیٹنا اور چھڑی کے سرے کو جگہ جگہ چبھو کر انہیں زخمی کرنا معمول کی بات تھی۔ مالک بھی بے گار پہ اور جانور بھی۔ اور اُس پر ظلم یہ کہ دونوں اپنے کھانے اور چارے کا بندوبست خود کریں۔ فیوڈل ریاست بڑی مکروہ اور ناترس ریاست ہوتی ہے۔

مکران میں وہ منظر تو انتہائی دردناک ہوتا تھا جب کہ کسی بلوچ کے بیگار میں پکڑے ہوئے اونٹ پر سوار ہو کر حکومت کا کوئی اہلکار اُسے دوڑائے جا رہا ہوتا اور پیچھے پیچھے وہ غریب تن بدن سے نیم عریاں، پاؤں سے ننگا بلوچ گرم دھوپ میں بھاگ رہا ہوتا تھا تا کہ بروقت منزل پر پہنچ کر اس اہلکار کے لیے پانی ڈھونے اور جنگل سے لکڑیاں توڑ کر لانے کے علاوہ اپنے اونٹ کے لیے بھی گھاس چارہ جمع کر سکے۔ مکران اور کچھی میں بیگار قابلِ نفرت شکل میں رائج تھی۔

نیشنل پارٹی نے اس ظلم کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہوئے اس کی منسوخی کا شدت سے مطالبہ کیا۔ خان قلات بالآخر نے پارٹی کے مطالبہ کو منظور کر کے ایک فرمان کے ذریعے پوری ریاستِ قلات میں ہر قسم کے بیگار لینے کی منسوخی کا اعلان کر دیا۔

4۔**مالی، بجار اور پرس** :۔مالی، بجار اور پرس مختلف نوعیتوں کے ٹیکس تھے جو قبائلی سردار اپنے قبائل سے وصول کیا کرتے تھے۔

مالی سالانہ ٹیکس تھا جو ہر قبائلی سردار اپنے قبیلہ کے ہر گھر سے بصورت ایک دنبہ (لوغئے پس، یا اس کی قیمت پانچ روپے نقد) وصول کیا کرتا تھا۔

بجار ابتدائی دور میں ایک اختیاری اور امدادی چندہ تھا جو شادی بیاہ یا کسی دوسری اہم ضرورت کے موقع پر قبیلہ کے افراد اپنے سردار کو دیا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ سردار اسے بھی موروثی حق کے طور پر جبراً وصول کرنے لگے تھے۔ ایسا بالخصوص انگریزی دور میں ہوا۔ (انگریز نے سب سے بڑا ظلم بلوچستان پہ یہ کیا کہ اُس نے سردار کو بہت مضبوط بنایا)۔ چوں کہ بجار کی وصولی کے لیے کوئی معیاد مقرر نہ تھی اس لیے سال میں کئی کئی بار نہ صرف قبیلہ کے سردار بلکہ سردار گھرانے میں سے

کوئی بھی فرد بجار وصول کرنے قبیلہ پر چڑھ دوڑتا تھا۔ یہاں تک کہ نئی ماڈل کی کوئی موٹر کار خریدنے یا پھر کوئٹہ، سبی یا کسی اور شہر میں بنگلہ تعمیر کرنے کے لیے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بھی سردار کے کارندے ''بجار'' وصول کرنے قبیلہ میں نکل آتے تھے اور انتہائی جبر و تشدد اور سینہ زوری سے قبائل کو لوٹ لیتے تھے۔

پُرس ایک ماتمی ٹیکس تھا۔ ابتدائی دور میں بجار کی طرح یہ ٹیکس بھی امدادی اور اختیاری تھا۔ یہ اس طرح تھا کہ جب کسی قبیلہ کا سردار یا اس کی کوئی اولاد یا کوئی قریبی رشتہ دار مر جاتا تو افرادِ قبیلہ مال مویشی یا نقدی کی صورت میں سردار کے جانشین یا سردار کو، ماتمی اخراجات کے لیے حسبِ مقدور کچھ نہ کچھ امداد دے دیا کرتے تھے۔ لیکن بعد ازاں انگریزی دورِ حکومت میں قبائل پر ظلم و ستم کی کھلی اجازت حاصل کر کے یہ ٹیکس بھی جبراً وصول کیا جانے لگا۔

گٹہ ٹیکس بھیڑ بکریوں پر لیا جاتا تھا۔

ان ٹیکسوں کے وصول کرنے والے براہِ راست قبائلی سردار تھے۔ اور ان کی منسوخی کا مطالبہ کرنا گویا سرداروں کے منہ کا نوالہ چھیننا تھا۔ جس پر بلوچستان بھر کے قبائلی سرداروں کی متفقہ اور شدید مخالفت کا سامنا کرنا یقینی بات تھی۔ بہرحال نیشنل پارٹی نے در پردہ قبائل کو مالی، بجار اور پرس دینے سے انکار کر دینے پر اکسانے کا کام کیا۔ بہ یک وقت ان معاملات میں افسران سے (جو کہ زیادہ تر نیشنل پارٹی کے ممبر تھے) کہا گیا کہ وہ سرداروں کے معاملات کو یا تو نظر انداز کر دیں یا انہیں تصفیہ کرانے میں اس قدر ڈھیل دے دیں کہ سردار خود اپنے مقدمہ کی پیروی کرنے سے عاجز آجائیں۔

اسی طرح، بلوچستانی اخبارات نے (جو ہفت روزہ ''استقلال'' کے سوا باقی تمام سندھ کے مختلف شہروں سے شائع ہوا کرتے تھے) سردار کے خلاف قبائل کو مالی، بجار اور پرس نہ دینے پر اکسانے میں بہت بڑا اور قابلِ قدر کام کیا۔ چار سال پہلے سے محمد نسیم تلوی، محمد حسین عنقا، محمد اسلم اچکزئی اور عبدالصمد اچکزئی نے اپنے اخبارات کے گراں قدر مقالوں کے ذریعے ان ٹیکسوں کے خلاف پیہم پروپیگنڈہ کی مہم شروع کر رکھی تھی۔

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ سب سے پہلے جھلاوان کے قبائل نے اپنے سرداروں کو مالی، بجار اور پرس دینے سے انکار کر دیا۔ سردار زہری خان موسیانی جیسے سردار کو اس سلسلے میں مولہ میں بڑی دِقتوں کا سامنا ہوا۔ سردار رسول بخش زرک زئی کو درہ مولا میں نڑ کے مقام پر اپنے ہی مسلح قبائلیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سردار رسول بخش ساسولی کے نائب کو قتل کر دیا گیا اور سردار رسول بخش مینگل کو اپنے قبیلہ کے ہاتھوں وڈھ چھوڑ کر لسبیلہ میں پناہ لینا پڑی۔ بپھرے ہوئے عوام کے مقابلہ میں بڑے بڑے سرداروں کی ایسی ناکامی اور شکست اور خان کی حکومت کی پُر اسرار خاموشی دیکھ کر جھلاوان کے دوسرے چھوٹے موٹے سردار دم بخود رہ گئے۔

سراوان کے سردار جھلاوان کو دیکھ رہے تھے۔ مگر جب انہوں نے جھلاوان کے سرداروں کا حشر دیکھ لیا تو وہ بھی ہمت ہار بیٹھے۔ اور انہوں نے از خود مالی، بجار اور پرس کے ٹیکس معاف کرنے کا اعلان کر دیا۔ عوام زندہ باد ہوں!!

1938ء میں سیاسی حالات بہتر ہونے اور پارٹی کی بہتر کارکردگی کی بدولت پارٹی کے سربراہ کو قلات حکومت میں وزارت دی گئی جسے پارٹی کی مجلس عاملہ نے منظور کر لیا۔(15) اور ادھر ہی سے تو پارٹی کی موت واقع ہونا شروع ہوئی۔ چنانچہ میر عبدالعزیز کرد جھلاوان کا نائب وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اور اس کی جگہ خالی شدہ پارٹی عہدے پر 1939ء میں ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کو پارٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ میر عبدالعزیز کرد 1942ء سے لے کر 1948ء تک ناظم کی حیثیت سے عوام کی خدمت کرتا رہا۔ 1948ء میں مکران کی علیحدگی اور قلات کی وحدت کو پاش پاش کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے میر عبدالعزیز کرد اپنے دیگر دوستوں کے ہم راہ ملازمت سے مستعفی ہو گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ (پاکستان جو بن گیا تھا!!)

ہند تقسیم ہونے اور پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی دیگر آزادی دوست انسانوں کی طرح میر صاحب کو بھی گوناگوں مشکلات کا شکار کیا گیا۔ لیاقت خانی امریکہ نوازی سے بات مارشل لاؤں تک پہنچی اور میر عبدالعزیز کرد ہر حکمران کے لیے خطرہ سمجھا گیا۔ اسے کبھی نظر بند کیا

گیا کبھی جیلیں اس کا گھر بنادی گئیں اور کبھی اس پر معاشی مشکلات کا دباؤ ڈالا گیا۔1958ء کے مارشل لا میں اسے سردار دینار خان کرد، میر عبدالرحمٰن کرد، میر محمد حسن نظامی، آغا عبدالکریم، عبدالقادر شاہوانی، سردار محمد زمان محمد شہی، آغا نصیر خان، خان عبدالصمد خان اچکزئی، ملک عبدالعلی کاکڑ، اور امیر جان محمد شہی کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔(16) اسی طرح 1959ء میں، اور پھر 1963ء میں اس نے مچھ جیل کو رونق بخشی۔1965ء میں تو اُسے بیٹوں، بھتیجوں اور داماد کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا۔اس کے ان عزیزوں کو لاہور کے شاہی قلعہ میں پانچ ماہ تک نہایت ''عزت واحترام'' اور ''آرام'' سے رکھا گیا۔جب کہ خود میر صاحب بیماری کے سبب سول ہسپتال کوئٹہ کے جیل وارڈ میں پڑا رہا۔

15 اپریل 1969ء کو قبائلی بلوچستان میں سیاست وصحافت کا رواج ڈالنے والا یہ آزادی پسند بڑا انسان 65 برس کی عمر میں وفات پا گیا۔اس کی زیارت عزیز آباد (مستنگ) میں ہے۔اس کے لیے موت کچھ نہ تھی وہ البتہ جیا ایک بھرپور زندگانی۔

بابو (عبدالرحمٰن کرد) نے اس کی قومی خدمات کو یوں سراہا:

کنا خواجہ کنا رہبر متو پیدا نما ہمسر
سپہ سالار جنگاتا ننا ناموس ننگا تا
اونا پن بے بہا گنجے اوناغم ننکے صدر نجے کریس اس
گرم بازارے بلوچ اینو کہ بیدارے

یہ بات ضرور نوٹ کیجیے کہ بلوچ ''سیاست'' میں ہماری اس اولین نسل کو بلاشبہ کسی بھی سیاسی ورثے تک رسائی نہ تھی۔لے دے کے انڈین نیشنل کانگریس تھی جس کے تجربات سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا تھا یا، جس کے لیڈروں سے رہنمائی لی جاسکتی تھی۔مسلمان کے نام سے سیاست کرنے والے جو چند گنے چنے سیاست دان یا مفکر موجود تھے تو وہ خود اسلامی نشاۃ ثانیہ (حتیٰ کہ جاگیری سلطنتِ عثمانیہ) کے احیا سے متعلق خیالات سے آلودہ تھے۔علاوہ ازیں جس معاشرے میں قبائلی

نظام کی جڑیں انتہائی گہری ہوں، وہاں جمہوری طرزِ سیاست، ظاہر ہے کہ قبائلی انا پرستی میں ملوث مذہبی زندگی میں رنگی ہوئی اور دائیں بائیں انتہاؤں کو چھوتی ہوئی ہوگی۔سو میر عبدالعزیز کرد اور اس کے رفقا میں بھی یہ کم زوریاں بالکل موجود تھیں۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ نپے تُلے انداز میں چلتے رہے۔انہوں نے موقع پرستی، ''ہیرو پرستی'' اور مہم جوئی کبھی نہیں کی اور ان کے پائے استقامت میں کبھی کوئی لغزش نہ آئی۔وہ پے در پے ناکامیوں اور منزلِ عشق میں بڑی اونچ نیچ میں بھی اپنی سیاست اور اپنے عوام سے جڑے رہے اور اپنے مؤقف سے کبھی دست بردار نہ ہوئے۔ان کی یاد' آزاد جمالدینی کی نصیحت کے مطابق ہمیں قرآن کی طرح تکریم کے ساتھ سنبھال کر رکھنا ہوگی۔

1932ء میں عبدالصمد خان اچکزئی نے کس قدر صحیح کہا تھا۔''............رفیق عبدالعزیز کرد کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔وہ سوائے آزادیِ وطن کے ایک 'بے صبر عاشق' کے اور کچھ بھی نہیں''۔(17)

حوالہ جات

1۔بلوچ' چاکر خان، ناقابل فراموش ملاقات۔1968ء۔ماہنامہ بلوچی دنیا۔جون، جولائی صفحہ 60۔رائٹرز کالونی۔ملتان۔

2۔بلوچ۔عنایت اللہ "The Problems of Greater Balochistan" (غیر مطبوعہ مسودہ)۔1986ء صفحہ نمبر 147۔

3۔رمضان، ملک ''میر عبدالعزیز کرد، شخصیت اور کردار'' ماہنامہ بلوچی دنیا جون جولائی 1968۔ملتان

4۔کرد، عبدالعزیز ''خودنوشت''۔ماہنامہ بلوچی دنیا۔جون جولائی 1968۔ملتان

5۔یوسف زئی۔ملک فیض محمد۔یادداشتیں۔1997۔پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کوئٹہ۔صفحہ 28

6۔نصیر،گل خان’’ بلوچستان قدیم و جدید کی روشنی میں‘‘۔ 1982ء۔نساء ٹریڈرز کوئٹہ۔ صفحہ 311,310

7۔بلوچ۔عنایت اللہ "The Problems of Greater Balochistan" صفحہ 148۔

8۔کرد،عبدالعزیز،خودنوشت داستانِ حیات۔ماہنامہ بلوچی دنیاملتان۔جولائی 1968 صفحہ 39۔

9۔کرد،میر عبدالرحمٰن’’اولین بلوچ رہنما‘‘ماہنامہ’’بلوچی دنیا‘‘ملتان۔جون جولائی۔1968۔صفحہ 66

10۔بلوچ عنایت اللہ۔ پرابلمز آف گریٹر بلوچستان کے اندر حوالہ دیا ہے روزنامہ زمیندار لاہور ۔18 ستمبر 1932 کا۔

11۔کرد۔میرعبدالعزیز۔روزنامہ’’احسان‘‘۔لاہور۔30 مئی 1938

12۔ایضاً

13۔ایضاً

14۔کردعبدالعزیز’’خودنوشت‘‘۔1968۔ماہنامہ بلوچی دنیا۔جون۔جولائی صفحہ 37۔

15۔کرد،عبدالعزیز’’خودنوشت‘‘۔1968ءماہنامہ بلوچی دنیا۔صفحہ 51۔

16۔احمد زئی ،نصیر خان۔ تاریخ بلوچ و بلوچستان ۔ جلد ہشتم ۔2000۔ سریاب روڈ کوئٹہ ۔ صفحہ 139

17 ۔اچکزئی، عبدالصمد ۔ ریاست قلات کے مستقبل کا سوال۔ ماہنامہ صدائے امروز کوئٹہ اگست 1996۔صفحہ 12۔

میر محمد امین کھوسہ

بی۔اے۔ایل ایل بی (علیگ)

(گیارہ دسمبر 1910.......1973)

ہیلو: میں غازی عبدالحق جکھرانی بول رہا ہوں ،جیکب آباد سے۔ میں سکول ٹیچر ہوں۔ مجھے رسالہ سنگت بھجوائیں۔

میں: جی اچھا ماسٹر جی۔ پتہ لکھوائیں۔

ماسٹر: غازی عبدالحق جکھرانی، ٹیچر ایس ایم اے ہائی سکول، جیکب آباد۔

میں: کون سا سکول؟

ماسٹر: ایس ایم اے یعنی سردار محمد امین ہائی سکول۔آپ نے تو نام سنا ہوگا۔ بڑی تاریخی شخصیت تھی۔

بھلا کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ مرید نے مرشد کا نام نہ سنا ہو۔ میں خوشی سے دمک اٹھا۔ ارے، میں تو بے کار میں چلّا تا پھرتا ہوں، لوگوں نے تو اپنے ہیروؤں کو یاد رکھا ہوا تھا۔

میں ماسٹر صاحب سے کچھ نہ کہہ سکا۔بس انہیں رسالہ بھیجنے کا یقین دلایا۔

سامراج دشمن تحریک اور قوم بلوچ کے اولین شہری سیاست کے رہنماؤں میں جناب امین کھوسہ ایک نہایت محترم ہستی ہے۔وہ میر یوسف عزیز مگسی کے رفقا میں سے تھا۔مگر سچی بات یہ

ہے کہ اپنی طویل العمری کی بدولت وہ یوسف عزیز مگسی سے لے کر غوث بخش بزنجو تک کے پورے بلوچ سیاسی عہد کا رہنما رہا...... بہت ہی متحرک اور زیرک رہنما۔ سندھ بلوچ سرحد پہ رہنے کی وجہ سے وہ بہ یک وقت سندھی قوم پرست بھی رہا اور بلوچ قومی عوامی تحریک کا رہنما بھی۔ بلا مبالغہ، ہمارے خطے میں امین کھوسہ کو روایتوں کا امین، ایک خیر خواہ اور متحد رکھنے والے رہنما کے بطور یاد رکھا جائے گا۔ اس کی وضع قطع بھی مخصوص ہوا کرتی تھی اور فکر و ذہن بھی یکتا۔ لمبی داڑھی، کھلے ڈھلے سفید رنگ کا بلوچی لباس، اور اوپر ڈھیلا ڈھالا واسکٹ جس کی جیبیں کاغذات اور رسائل ٹھونسے رہنے کی وجہ سے سرمایہ دار کی توند کی مانند ابھری شکن آلود رہتی تھیں۔

اسی جیکب آباد کے اِسی کھوسو خاندان کے لوگوں نے 1857ء والی جنگِ آزادی میں انگریز کے خلاف اِس قدر زبردست جنگ کی کہ اِن کے سربراہ دل مراد خان اول کو انگریزوں نے ملک بدر کر کے کالا پانی (جزیرہ انڈیمان) بھیج دیا تھا اور وہیں اس کا انتقال ہوا تھا۔ اس کی لاش تک واپس نہ آنے دی۔

ہمارا یہ محسن اور لیڈر جیکب آباد کے ایک گاؤں گوٹھ حیات خان میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت 11 دسمبر 1910ء ہے۔ والد کا نام حاجی عبدالعزیز تھا۔ حج ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا گھرانہ پیسے والا تھا۔ وہ کھوسہ بلوچ تھا۔ حاجی صاحب اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے خصوصی دلچسپی لیتا تھا۔ میر محمد امین کھوسہ نے 1929ء میں میٹرک کر لیا۔

اس زمانے میں سب سے بڑا تعلیمی ادارہ علی گڑھ تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حاجی عبدالعزیز نے اپنے لختِ جگر کو اعلیٰ تعلیم کے لیے 1929ء میں وہاں بھجوایا۔ جہاں نہ صرف اسے اچھی تعلیم ملی بلکہ امین کو سامراج دشمنی اور وطن کی آزادی جیسے نظریات بھی میسر آئے۔ انھی نظریات کی بدولت وہ اِس سیاست کے دیگر کارکنوں اور راہنماؤں سے واقف ہوا۔ اور انھی نظریات نے اسے مستقبل قریب اور مستقبل بعید کے اُس کے بے شمار روحانی بیٹے بیٹیاں عطا کیں۔

وہ ابھی علی گڑھ میں طالب علم ہی تھا کہ 1932ء والی جیکب آباد کی آل انڈیا بلوچ و بلوچستان کانفرنس منعقد ہوئی۔ وہ چوں کہ میر یوسف عزیز مگسی سے آشنا تھا، اس لیے یہ بہت ہی

فہمیدہ، زندہ دل اور پر جوش شخص اس کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلے میں ملتان کے اجلاس میں بھی گیا تھا۔ خان عبدالصمد خان لکھتا ہے کہ: ''1932ء میں جیکب آباد کانفرنس کے دوران میری ملاقات محمد امین خان کھوسہ سے ہوئی جو اُس وقت نوجوان تھے، اور علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے............ وہ علی گڑھ میں وکالت پڑھ رہے تھے اور وہاں سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ اور اپنے اولین خطبہ صدارت میں بلوچستان کے بارے میں بہت اچھی اور بھاری باتیں کی تھیں۔ انہیں کالج سے نکال دیا گیا تھا مگر سندھ و بلوچستان کے بے شمار لوگوں کے ٹیلی گراموں اور مطالبوں کے پیش نظر یہ احکامات واپس لیے گئے تھے''۔

میر محمد امین کھوسہ نے علی گڑھ کے زمانے میں آل انڈیا بلوچ ایسوسی ایشن قائم کی جس کا محور و مرکز محدود قوم پرستی نہ تھی بلکہ بلوچوں کو متحد کر کے ایک زیادہ وسیع اور کل ہند سطح پر قومی جدوجہد میں شرکت کرنے کے لیے آمادہ کرنا تھا...... وہ 1931ء میں دہلی میں منعقد ہونے والی دوسری آل انڈیا مسلم کانفرنس میں ایک مندوب تھا۔

یوں میر امین کھوسہ طالب علمی کے زمانے ہی سے سیاست سے نہ صرف بلد ہو گئے تھے بلکہ ایک اچھی خاصی ہلچل والی سٹوڈنٹ پالیٹکس کرتے رہے۔ اُس زمانے میں آزادی کی تحریک پورے ایشیا میں عروج پر تھی۔ اور اس تحریک سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ ایک بہت ہی غبی، کند ذہن یا بے حس شخص ہی اس تحریک سے لاپرواہ رہ سکتا تھا۔ امین کھوسہ تو بہت ہی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ انہیں غلامی بھلا کیسے قبول ہوتی۔ لوحِ محفوظ پر ان کی تقدیر میں انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد میں ایک بڑا نام پیدا کرنا لکھا گیا تھا۔

میر محمد امین کھوسہ نے 1933ء میں شادی کی۔

محمد امین کھوسہ نے علی گڑھ سے 1934ء میں گریجویشن کر لیا اور دو سال بعد یعنی 1936ء میں علی گڑھ ہی سے ایل ایل بی کر لیا۔ لہٰذا اُن کی تعلیم بی اے، ایل ایل بی تھی۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل لوگ اپنی ڈگری کے آخر میں بریکٹوں میں لفظ ''علیگ'' بھی لکھتے تھے۔

چنانچہ یوں ہوا:

میر محمد امین کھوسہ، بی ایل اے، ایل ایل بی (علیگ)۔

علی گڑھ کے زمانے ہی میں انہوں نے ''آل انڈیا بلوچ ایسوسی ایشن'' قائم کی جس کا مقصد بلوچوں کو متحد کر کے ایک وسیع اور کل ہند سطح پر قومی جدوجہد میں شرکت کے لیے آمادہ کرنا تھا۔ میر صاحب نے تعلیم مکمل کر کے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو عوامی سیاست اور عوامی خدمت کے لیے سندھ اور بلوچستان کو اپنی تگ ودو کا میدان بنایا۔ بالخصوص، بلوچستان کی سیاست میں تو ان کی دلچسپی اور وابستگی بہت ہی راہنمایانہ رہی۔ 3 مئی 1936ء کو سیٹھ عبداللہ ہارون کو اپنے خط میں اپنی فکرمندی یوں دکھاتے ہیں: ''بلوچستان سے اطلاع ملی ہے کہ حکومت قلات نے عبدالعزیز خان کرد کو رہا کر دیا ہے۔ میں آپ کو کم از کم ایک معاملے کی کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کیا آپ از راہِ نوازش بلوچستان میں گورنر کے ایجنٹ اور پولیٹیکل سیکرٹری سے رابطہ قائم کریں گے تا کہ خان عبدالصمد خان کو بھی جلد از جلد رہا کر دیا جائے؟''۔(1)

تعلیم کی تکمیل کے بعد صمد اچکزئی اور عزیز کرد کے یہ بہی خواہ وطن میں آ کر صحافت اور سیاست میں مشغول ہو گئے۔ واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچستان میں سامراجی حکومت کی طرف سے تصور سے ماورا مظالم ڈھائے جاتے تھے' قبائلی سردار انگریز سامراج کی غلامی پر فخر کیا کرتے تھے اور خطابات حاصل کرتے رہتے تھے، اور عوام الناس بغیر راہنمائی اور بغیر سیاسی پارٹی کے غلامی کی ظلمتوں میں غلطاں تھے۔ عین اس حالت میں جھل مگسی کے ایک نوجوان محبّ وطن سردار یوسف علی خان مگسی، بلوچوں کی اصلاح اور اُن کو حقوق دلانے کے لیے اٹھے۔ آل انڈیا بلوچ اینڈ بلوچستان کانفرنس بلائی اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے تگ ودو شروع کر دی۔ انگریز کا اتنا رعب تھا کہ کسی سردار کو اُس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہوتی تھی............انگریز اس وقت حیرت زدہ رہ گئے جب اچانک جیکب آباد کے ایک چھوٹے گاؤں عزیز آباد سے یوسف علی خان کی حمایت اور انگریز سامراج کے خلاف ایک باطل شکن آواز اٹھی جس نے قصرِ سامراج کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ آواز تھی، جناب محمد امین کھوسہ کی۔ کھوسو صاحب نے نواب یوسف علی خان کے خاص رفیق اور راست بازو بن کر بلوچوں کی اصلاح اور وطن کی آزادی کے سلسلے میں زبردست تحریک

چلائی۔ موت ہی دبا سکی اس بلند آہنگ کو۔

برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کے کاروان میں بہت ہی نفیس اور مہذب انسان شامل تھے۔ بہت ہی باوفا، وضع دار اور بھاری شخصیتوں والے۔ انھی میں سے ایک میر عبدالرحمٰن بگٹی بھی تھے۔ وہ انگریز سامراج کے سخت مخالف تھے اور قومی آزادی کے بڑے ہی نڈر اور محترم راہنما۔ میر محمد امین کھوسہ میر عبدالرحمٰن بگٹی کے معتمد رفیق تھے۔ جب بگٹی صاحب کو رانچھی جلاوطن کر کے وہاں نظر بند کیا گیا تو اس دوران نواب اکبر بگٹی کے بقول، صرف کامریڈ محمد امین ان کے ملاقاتی اور سکھ پہنچانے والے تھے۔(2)

بے شمار صلاحیتوں والے میر صاحب نے نری قوم پرستی نہ کی۔ وہ تو ایسے شخص نہ تھے کہ تباہ حال کسانوں اور ان کی تحریک کو نظر انداز کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ امین کھوسو شعوری طور پر محروموں' مجبوروں اور مظلوموں کے اولین بلوچ ساتھی تھے۔ جسمانی مشقت کرنے والے اُن پر بھروسہ کرتے تھے، انہیں اپنا سمجھتے تھے۔ اس شعلہ بیان مقرر اور پرزور قلم کے مالک امین نے سندھ ہاری پارٹی بنانے اور چلانے میں بہت محنت کی۔ وقت، محنت، سفر، پیسہ جو کچھ تھا' جھونک دیا۔ امین کسانوں مزدوروں اور ان کی تحریک کے ساتھ اس قدر جڑے ہوئے تھے کہ 1937ء میں سندھ ہاری کمیٹی کی صدارت فرمائی۔ یہ اس لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے کہ عام غریب لوگ اور ان کی تحریک صرف اُسی شخص کو خود میں گھلنے ملنے کی اجازت دیتے ہیں جو قول اور فعل میں ان کی سوچ اور تحریک سے مطابقت رکھتا ہو۔ دھوکے کھا کھا کر یہ طبقہ دوسرے طبقات کے لوگوں کو بہت شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ الفاظ اور فقرے نہ بھی ہوں تو یہ لوگ اپنے بے ساختہ رویوں کے ذریعے قبول' ناقبول کا اظہار کرتے جاتے ہیں۔ ایک ایسے طبقے کی تحریک میں نہ صرف شامل ہونا بلکہ اس کی صدارت کرنا ایک اچھے اور نجیب انسان کی نشانی ہے۔ کھوسو صاحب رفتہ رفتہ کمیونسٹ نظریات کی طرف کھنچتے چلے گئے اور وہ سوشلزم کی سیاست میں جُت گئے۔ وہ اس سیاست میں تن من دھن سے اس قدر مگن رہے کہ اُن کے دوست خان عبدالصمد اچکزئی نے انہیں بہت ''بد'' (Rabid) کمیونسٹ لکھا۔(3) کھوسہ صاحب نے مارکسزم کو خوب پڑھا، ہضم کیا، اس کے لیے کام کیا اور بے انت شعور حاصل کیا۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ سندھ بلوچستان کے ہمارے اِس خطے میں جو اولین کمیونسٹ پارٹی 1937ء میں بنی، اس کے بانیوں میں محمد امین کھوسو شامل تھے۔

کھوسہ صاحب نے 1938ء میں سندھ اسمبلی کے الیکشنوں میں حصہ لیا۔ ان کا الیکشن نعرہ تھا: انقلاب۔ اس لفظ ''انقلاب'' کے ساتھ بھی برصغیر میں کیا کچھ نہ ہوا۔ حالاں کہ یہ تو سیدھا سادا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: پولیس کی گرفت سے نجات، سرداروں' جاگیرداروں اور زمین داروں کے پنجے سے آزادی، رشوت چوری اور جرائم سے چھٹکارا، سرکاری محاصل اور زمین پہ ٹیکس میں کمی......

کھوسہ صاحب کا مقابلہ ضلع جیکب آباد کی ایک بااثر شخصیت، زمین دار اور سردار' شیر محمد خان بجارانی کے ساتھ تھا۔ ایسا بڑا سردار کہ امین کے ساتھیوں کو اکثر گاؤں میں کوئی اپنے ہاں ٹھہرانے کے لیے بھی تیار نہ ہوتا۔ سردار اور سرکار دونوں کا خوف مل کر جو دہشت طاری کرتے ہیں اس کو تو پکاسو بھی پینٹ نہ کر سکے گا۔ چنانچہ امین کے کامریڈز ویرانوں اور قبرستانوں میں جاکے راتیں بسر کرتے تھے۔ مگر جب الیکشن کا رزلٹ نکلا تو سردار کو شکست ہوگئی اور 'بے چارے' امین کھوسو کامیاب ہوگئے، اور وہ بھی کئی ہزار ووٹوں سے۔ اس طرح ایک عام سیاسی ورکر سندھ اسمبلی کا ممبر بنا، اور وہ بھی کانگریس کی ٹکٹ پر۔ یہ بذاتِ خود اِس پورے خطے میں ایک انوکھی مثال تھی۔ کمیونسٹ پارٹی سندھ بلوچستان کے 'بانی' کانگریس کی طرف سے سندھ اسمبلی کے ممبر............!! امین خود تو وزیر نہ تھے مگر کانگریسی حکومت نے کچھ بہت اچھے کام کیے۔ اس حکومت نے مولانا عبیداللہ سندھی کو جلاوطنی ختم کر کے واپس آنے کی اجازت دے دی۔ جملہ سیاسی قیدی رہا کر دیے۔

امین کھوسہ 1945ء تک اس اسمبلی کے ممبر رہے(4)۔ کانگریسی وزیرِاعلیٰ شہید اللہ بخش سومرو امین کے گہرے دوست تھے۔ صوبائی کمیونسٹ پارٹی کے خفیہ کاغذات وہی کانگریسی وزیرِاعلیٰ ہی تو پارٹی مرکز بمبئی تک پہنچاتا تھا۔(5) ہے نا، ناقابلِ یقین بات!!

یہ اللہ بخش سومرو اتنے زبردست آدمی تھے کہ کمیونسٹ اس پر بہت اعتبار کیا کرتے تھے۔

قادر بخش نظامانڑیں کے بقول، ''ہم لوگوں نے کچھ غیر قانونی پمفلٹ نسیم تلوی کے پریس سے

چھاپے، پمفلٹ جب پکڑا گیا تو پولیس نے نسیم کو گرفتار کر لیا اور مقدمہ چلایا۔ ہمیں امید تھی کہ وہ رہا ہو جائیں گے' اس لیے کہ وزیرِاعلیٰ، اللہ بخش تھے''۔

اسی زمانے میں کھوسہ صاحب ''آزاد'' نام سے ایک سندھی اخبار نکالنے لگے۔ چوں کہ وہ سندھ اسمبلی کے رکن تھے، اس لیے ڈیکلریشن با آسانی ملا۔ نظامانڑیں اور دیگر سامراج دشمن ترقی پسند لوگ اس اخبار میں لکھتے تھے۔ اس کام میں شہید اللہ بخش سومرو خوب مدد کیا کرتے۔ بقول نظامانڑیں، ''میں نے اب تک جتنے اچھے لوگ دیکھے، ان میں وہ ایک بہت اچھے آدمی تھے''(6) انہیں بعد میں سامراج اور رجعت اور فیوڈلزم، یعنی مسلم لیگ نے مل کر شہید کر دیا۔

کھوسہ صاحب ہمارے باعمل اور جید عالم عبیداللہ سندھی کے زبردست ساتھی تھے۔ مولانا سے ان کی ملاقات 1939ء میں ہوئی تھی۔ مولانا سندھی انہیں پیار سے 'خان' کہتے تھے۔(7)

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں مولانا عبیداللہ سندھی برصغیر کے بہت بڑے انقلابی راہنما تھے۔ وہ ایک محترم سامراج دشمن، ایک معتبر آزادی پسند اور ایک معزز انقلابی تھے۔ یہی مولانا تو تھے جو ملک کی آزادی کا ایک انقلابی منصوبہ لے کر افغانستان گئے تھے، جس میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ اور انہیں افغانستان سے نکلنا پڑا تھا۔ چوں کہ ہندوستان کے دروازے ان پر بند ہو چکے تھے، اس لیے وہ روس چلے گئے۔ مولانا تقریباً ایک سال ماسکو میں رہے، انقلاب کے روسی رہنماؤں سے ملے اور انقلابی خیالات سے واقفیت حاصل کی۔

اسی مولانا نے تو فرمایا تھا: ''میں چراغِ سحری ہوں، بُجھا چاہتا ہوں لیکن مرنے سے پہلے آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انگریز بہت مکّار ہیں۔ وہ اب بھاگ رہے ہیں۔ لیکن بھاگنے سے پہلے اس خطے کو اِس طرح تقسیم کر دیں گے کہ تم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہو گے۔ انگریز کی سازش ہوگی کہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، پنجاب، سندھ، پشتون علاقے اور بلوچ علاقوں کو دو دو حصوں میں تقسیم کر دے۔ تم لوگ مذہب کی تقسیم کے نام پر اس کی مکاری میں مت آنا۔ امریکہ اور سوویت یونین کی طرز پر ہندوستان کی خود مختار ریاستیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ ثقافت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہئیں۔ جہاں جہاں کوئی قوم آباد ہے، اُن کا اپنا خطہ زمین ہے۔ علیحدہ

تہذیب، ثقافت اور زبان ہے۔ اُن کی اپنی علیحدہ ریاست ہونی چاہیے۔ ہندوستان کے لوگو! انگریز مکّار کی چالوں سے ہوشیار رہنا، انقلابی بنو، طوفانِ نوح آیا ہوا ہے یا گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بادل برسنے کو ہیں، وقت اور وقت کی رفتار کو دیکھو، یہاں کے سیاست دان بے بصیرت ہیں۔ وہ اپنی ذات کے خول میں بند ہو چکے ہیں۔ اُنہیں ذاتی مفادات کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا، علما کتابی کیڑے بن چکے ہیں۔ وہ مذہب کی غلط تشریح کر رہے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تورات اور انجیل کی غلط تشریحات کرنے والے یہودی اور عیسائی کافر ہیں تو قرآن کی غلط تشریح کرنے والے مولوی بھی مسلمان نہیں ہو سکتے۔ قرآن حق کی بات کرتا ہے۔ انصاف کی بات کرتا ہے۔ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی بات کرتا ہے۔ غریب، محنت کش، مزدور اور دہقان کی بات کرتا ہے۔ کسی کو بھوکا مت رہنے دو۔ مولویو! یاد رکھو بخارا کی ایک یونیورسٹی میں 70 لاکھ انسانوں نے عربی علوم پڑھے لیکن ظلم زیادتی کے سامنے بخارا کی مذہبیت نہ رُک سکی، ترکی کی سیاست نہ رُک سکی، آپ کون سے باغ کی مولی ہیں۔ دوسری کی کمائی سے اپنا حرام پیٹ مت بھرو۔ محنت کش بن جاؤ اور انقلاب کی راہ ہموار کرو۔ غریبوں کے خون پسینے سے محلات بنانے والوں کو پرکھو۔ غریب کی جھونپڑی سے انقلاب اُٹھتا ہے تو اُمرا کے محلات کو نیست و نابود کر دیتا ہے"۔ (بحوالہ، رسالہ "ترجمان الاسلام" 1969ء)۔

بلاشبہ مولانا سندھی ایک مستند عالم دین تھے لیکن ان کی تعلیمات مسجد کے صحن اور خانقاہ کی دہلیز تک محدود رہنے والی نہ تھیں۔ وہ ملک کے سب سے بڑے طبقے یعنی کسان اور مزدور کو جگانا چاہتے تھے اور انہیں باشعور بنا کر، منظّم کر کے حکومت پر قبضہ دلوانا چاہتے تھے۔ وہ اسی طبقے کی حکومت چاہتے تھے۔ اسی مولانا سندھی نے ایک بار ہمارے امین کھوسو کی امامت میں نماز پڑھی (8)۔ وہ تو اپنی محفلوں میں فرماتے: "خان میرا ہے اور میں خان کا ہوں"۔ (پتہ نہیں ہم کیوں احساسِ کم تری کا شکار لوگ ہیں!)

عبیداللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ کے یہ "خان" ایک متحرک انسان تھے۔ کبھی چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ ہمیشہ بلوچستان کے قومی کاز کے لیے کام کرتے رہتے۔ ایک متحرک سیاسی کارکن اور راہنما، ایک نظریہ دان و نظریہ ساز انسان تھے وہ۔ مظلوم قومیں ہوں یا محکوم طبقات، امین کھوسو جبر کی

ہر شکل کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ ظلم کے خلاف ہر مورچہ اُن کا مورچہ تھا۔ جب 1939ء میں خان عبدالغفار خان بلوچستان کے اپنے اولین دورے کے موقع پر اوستہ محمد آئے تو امین کھوسو وہاں موجود تھے۔ دیگر اکابرین میں نور محمد پروانہ، خان عبدالصمد خان اچکزئی، میر محمد حسین عنقا، اور محمد اسلم اچکزئی موجود تھے۔ محمد امین کھوسہ نے برطانوی سامراج کے خلاف نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ تقریر کی تو حکومت کے ٹوڈیوں نے میر جعفر خان اور دیگر زمینداروں کی سربراہی میں حملہ کرا دیا۔ محمد امین خان کی پیشانی پر کلہاڑی سے وار کیا گیا۔ وہ بری طرح زخمی ہوئے۔ زخم نے آخر ٹھیک ہونا تھا، ہو گیا۔ تندرستی آنی تھی، سو صحت یاب ہو گئے مگر زخم نے نشان بنائے بنا مندمل ہونے سے انکار کیا۔ کتنا پاک فیصلہ تھا زخم کا۔ اس لیے کہ جاگیرداروں کی نارواۓیوں کی سیکڑوں علامتیں رشوت، خوف، دھونس اور لالچ سے روزانہ مٹا دی جاتی ہیں مگر فطرت اور امین کھوسہ نے ایسا کرنے سے "نہ" کر دیا۔ اور یوں بلوچستان کے جاگیرداروں کی فرعونیت اور قوم کی نادانی، پیشانی پر ایک بڑے اور صاف نظر آنے والے نقش کی صورت باقی رہ گئی۔ ع:

ہر اک داغ ہے اِس دل میں بجز داغِ ندامت

اور یہ والا نقش تو بلوچ کی یادداشت کا امتحان رہے گا......ابد تک!!

زخمی پیشانی مگر تندرست کھوپڑی والا یہ پرعزم انسان اپنی سامراج دشمنی کی راہ پہ استقلال کے ساتھ چلتا رہا۔ کہیں ٹھوکر لگی کہیں ٹھٹھا نصیب ہوا، اور کہیں خیر مقدم کیا گیا...... سیاسی کارکن کی زندگی انھی تلخ و شیریں لمحوں کے مجموعے کا تو نام ہے۔ کھوسہ ان تلخ و شیریں لمحوں کو جیتے رہے۔ آزادی نامی آبِ حیات کی تلاش میں بی بی حاجرہ کی سنت میں کبھی یہاں دوڑ پڑے، کبھی وہاں بھاگتے رہے۔

جب دوسری عالمی جنگ چھڑی تو کمیونسٹ لوگ برطانیہ کے خلاف جدوجہد کے ہراول کا کام کر رہے تھے۔ لیکن سوویت یونین پر ہٹلر کے حملے کے بعد صورت حال ہی بدل گئی تھی۔ سوویت یونین پر حملے کے سات دن بعد 28 جون 1941ء کو سندھ، بلوچستان پارٹی نے طویل بحث کے بعد قرارداد پاس کی کہ "سوویت یونین پر حملہ ہونے سے اب جنگ کی نوعیت بدل چکی ہے اور سوویت

یونین، جوکہ محنت کش عوام کی واحد اور پہلی مملکت ہے، اس کی بقا اور اس کا وجود سب سے مقدم ہے۔ اس لیے جنگ کی مخالفت ترک کر کے ہٹلر کے خلاف جنگ کی حمایت کی جائے۔‘‘

قادر بخش نظامانڑیں پارٹی کے سیکرٹری تھے اور امین کھوسو کمیٹی کے اہم ممبر۔ کھوسہ صاحب نے، جو اس وقت سندھ اسمبلی کے ممبر تھے، سندھ اسمبلی میں جنگ کی حمایت میں تقریر کی اور کہا کہ ہم (کمیونسٹ) دوسری عالمی جنگ میں سرکاری کوششوں میں اس کا ساتھ دیں گے۔ پورے ہندوستان کے کمیونسٹوں کو نہ صرف اس بات کا ادراک نہ ہوا تھا بلکہ انہوں نے الٹا ہمارے ان اکابرین کے خلاف تادیبی کاروائی کی۔ تقریباً چھ ماہ بعد دسمبر 1941ء میں انڈیا کی کمیونسٹ پارٹی نے جا کر وہی لائن اپنالی جس پر ہمارے بلوچ کمیونسٹ اکابرین چھ ماہ پہلے پہنچ چکے تھے(9)۔ سزا کے بطور نظامانڑیں صاحب کی رکنیت معطل ہوگئی۔ اور میر محمد امین کھوسو پارٹی کے سیکرٹری بنا دیے گئے۔ کچھ عرصہ بعد جمال الدین بخاری کو پارٹی منظّم کرنے کراچی بھیجا گیا۔ اور کھوسو صاحب غیر فعال ہوگئے۔

1941ء میں اُن پر برٹش حکومت کے خلاف سازش کا مقدمہ چلا۔ مقدمہ کا فیصلہ 1942ء میں ہوا اور وہ چھ ماہ کے لیے جیل کے حوالے ہوئے(10)۔ یہی دلچسپ شخص 1946ء میں مسلم لیگ کا جوائنٹ سیکرٹری بنا۔ اُسی مسلم لیگ کا جس نے 1948ء میں انہیں نظر بند کر دیا۔ ہم خود میں اپنے بزرگوں پر انگلی اٹھانے کی سکت اور حق نہ رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ 1950ء سے لے کر 1970ء تک کھوسہ صاحب ہل چل اور نظر آنے والی سیاست سے لاتعلق رہے۔ وہ 1970ء میں ایک بار پھر سیاست کے افق پہ نمودار ہوئے۔ سیاست کا یہ دوسرا دور 1970ء سے لے کر اُن موت 1973ء تک جاری رہا۔ اس بار وہ پیپلز پارٹی کی حمایت کرنے لگے۔ مگر یاریاں تو بزنجو کے حلقہِ سیاست کے راہروؤں کے ساتھ تھیں۔ بھٹو مست ہاتھی تھا۔ نیپ سے الجھ پڑا۔ سب کو اندر کر دیا۔ اس نیپ بھٹو مناقشے میں کھوسہ صاحب کی حیثیت عجیب ہوگئی۔ ایک طرف پرانے سامراج دشمن اور جمہوری دوست تھے اور دوسری طرف روٹی کپڑا اور مکان دینے کی دعوے دار پیپلز پارٹی۔ وہ بیچ میں پڑ گئے۔ انہوں نے بھٹو کو مشورہ بھی دیا اور پیشکش بھی کی کہ ان کی ’’ضمانت پر نواب

خیر بخش خان مری، میر غوث بخش خان بزنجو اور سردار عطا اللہ خان مینگل کو فوراً رہا کر کے ان سے بات کی جائے‘‘۔(11)

مگر کون مانے گا ایک بے سروسامان سیاسی ورکر کی بات۔ ایک بادشاہ اور ایک قیدی کے بیچ پڑنے کے لیے تو اور بھی بہت لوازمات چاہئیں۔ اِدھر مسئلہ یہ تھا کہ قیدی سیاسی ورکر تھے۔ نیچے سے سیاست کرتے کرتے جیلیں، قلی کیمپ، جلاوطنیاں سہہ سہہ کر یہاں تک پہنچے تھے۔ جب کہ بھٹو تو ایوبی کابینہ سے نکلے اور دو ایک سال بعد ایوب سے بھی بڑے عہدے پر براجمان ہوئے۔ دونوں اطراف کے سیاسی کلچر ہی جدا تھے۔ مگر امین تو امین تھے۔ وہ بھلا کیوں کر باز آتے اپنی خیر وصلح کی کوششوں سے۔

’’میں نے ان تینوں، نواب اکبر خان، نواب خیر بخش خان اور سردار مینگل کو ملانے اور بھٹو سے صلح کرانے کی مہم کو ترک نہیں کیا۔ کام یقیناً مشکل ہے۔ خصوصاً جب فریقین میں ایک حاکم ہو اور دوسرا قیدی، تو صلح کرانے والے کا کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ بیچ میں مزہ اڑانے والے میری کوششوں کو بارآور ہونے کیسے دیں گے!‘‘ (12)

چنانچہ مزے اڑانے والے کامیاب رہے۔ نیپ کی جوانیاں جیلوں میں بوڑھی ہوگئیں، بھٹو پھانسی ہوا۔ پاکستان میں بسنے والے نچلے طبقات اور محکوم قومیں بدستور لٹتی رہیں، پٹتی رہیں۔

پاکستان میں آباد قوموں کی خودمختاری کھوسہ صاحب کا راسخ عقیدہ تھا۔ وہ لوگوں کے اندر موجود زبان، ثقافت، تاریخ اور نفسیاتی فرق کو ہرگز ہرگز نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر قوم کی آزادی آبادی کی اہمیت سے خوب باخبر تھے۔ چنانچہ بہت ہی کرخت ون یونٹ کے پس منظر میں جناب امین کھوسو صاحب قوموں کے حقوق کے زبردست حامی تھے۔ اس فقرے سے ان کی سوچ کا اندازہ لگائیے: ’’سندھ کی آزادی وخودمختاری کی تحریک نہ غداری ہے، نہ دوسروں سے بغاوت ہے اور نہ ملک اور دوسرے صوبوں کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش‘‘۔(13) جناب کھوسو نے سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کرانے اور مستقل صوبہ بنانے کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک جگہ تو انہوں نے یہ خوبصورت فقرہ بھی لکھا: ’’میں اپنی سندھ پروری کی سیاست کا امام ومرشد ہوں‘‘(14)۔

مگراس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ کوئی حقوق میں انتہا پسندی کی سرحدیں چھولے۔امین تو اپنے دوست جی ایم سید تک کو معاف نہیں کرتے تھے۔ایک بار ایک خط میں انہوں نے انہیں یوں لکھا: ''سیدِ اعظم، تم پر حضرت محمد صلعم کی جو شفقت ہے اس کا احساس رکھو۔غلط سیاست نہ کرو۔اردو، سندھی، عبرانی چہ معنیٰ دارد۔دوست کا نام جس زبان میں آئے وہی زبان پیاری اور محبوب ہے''۔کتنا صاف ذہن چاہیے، کتنی جرأت چاہیے صراطِ مستقیم پہ چلنے کو!! پھر بھی کہتے ہیں کہ سیاست میں نہ وعدوں کی پاسداری ہوتی ہے، نہ جھوٹ اور سچ کے درمیان کوئی خط امتیاز باقی رہتا ہے۔جی ایم سید جیسے لیڈر کو امین ہی راستہ دکھاتے ہیں، مسلم لیگیوں کے ون یونٹ کو امین ہی کوستے ہیں۔امین اور اس کے قبیل کے لوگ سیاست کو ہی وعدہ بنا چکے، سیاست ہی کو سچائی کا چراغ بنا بیٹھے۔

میر محمد امین کھوسہ بہت وضع دار انسان تھے۔وعدوں کے پاس دار اور سچائی کے چراغ تھے وہ۔کھوسو صاحب شاہ ولی اللہ کے علاوہ سبھاش چندر بوس، باچا خان، عبدالصمد اچکزئی، جی ایم سید، ذوالفقار علی بھٹو، غوث بخش بزنجو، نواب خیر بخش مری، عطا اللہ مینگل، خان قلات میر احمد یار خان، اور نواب محمد اکبر بگٹی سے ذاتی دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔اس قدر بُعد الطرفین لوگوں سے بہ یک وقت دوستی رکھنا اور معتبر دوستی رکھنا کس قدر با اعتبار اور سچا انسان بنے رہنے کی شرط پر ممکن ہوتا ہے۔بلاشبہ محمد امین کھوسہ ایک با اعتبار اور سچے انسان تھے۔

اپنے دوست یوسف عزیز مگسی کی طرح امین کھوسہ بھی بہت خوب صورت اردو اور سندھی لکھتے تھے۔جناب یوسف علی خان نے ایک خط میں انہیں ''سندھی شیکسپیئر'' لکھا تھا۔(15)

وہ سندھی زبان کے بہترین ادیب اور انشا پرداز تھے۔ان کی تحریروں میں بڑی دل آویزی اور معنویت ہے۔زبان سادہ، آسان اور عام فہم ہے۔ان کی زیادہ تر تحریریں خطوط کی شکل میں ہیں۔جو کہ افکار اور معلومات کا خزینہ ہیں۔کھوسہ صاحب نے جی ایم سید کے نام پر ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا: ''سیدِ اعظم''۔(16)

یاروں کے یار تھے امین کھوسو۔وہ اپنی دوستیاں خوب خوب نبھاتے تھے۔اور لگتا ہے فطرت نے اُن کی اس خوبی کا بار بار امتحان لیا۔جب اُن کے پرانے رفقا بلوچستان میں آپس میں

رنجشوں کا شکار ہوئے تو یہ امین کھوسہ ہی تھے جو اُن کے بیچ پُل بنے رہتے۔خان عبدالصمد خان اچکزئی لکھتے ہیں: ''مجھ سے اب بھی بہت میٹھی اور مضبوط دوستی ہے۔''اور ایک جگہ خان نے انہیں ''میرے میٹھے دوست'' (17) کہا تھا۔یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ سارے دوست نظریات کے حوالے سے امین کھوسہ سے بہت دور تھے مگر یاری تو پھر یاری ہوتی ہے۔اور اُس نسل کے ہمارے اکابرین رواداری اور اچھی روایتوں کے امین ہوا کرتے تھے۔

جیسے کہ ذکر ہوا میر محمد امین کھوسہ بلوچستان کے لیے صوبائی درجہ کے حصول کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔انہوں نے اس مقصد کے لیے بھر پور محنت کی۔مگر جب وقت آیا تو بھٹو اور بلوچستان کے رہنماؤں کے باہمی اختلافات کے باعث معاملات بہت بگڑ گئے۔بھٹو کی فوجی چڑھائی نے معاملات کو مزید بگاڑ کر رکھ دیا۔خان عبدالصمد اچکزئی، بھٹو کے ساتھ ہو لیے اور بقیہ نیپ دوسری جانب۔خود بلوچوں کے اندر باہمی اختلافات اور صوبہ مرکز کے درمیان لڑائی سے امین بہت دل گرفتہ ہوئے۔ان کی خواہش تھی کہ بلوچ مسئلہ سیاسی مذاکرات سے حل ہو۔چنانچہ ضعیف العمری کے باوجود وہ کوئٹہ اور سہالہ کے درمیان چکر لگاتے رہے۔

ایسی صورت میں کیا کیا الزامات ہوں گے جو ایک دوسرے پر نہ لگائے گئے ہوں۔بہت بدگمان ہوگئی لیڈرشپ آپس میں۔بھٹو کا ساتھ دے کر عبدالصمد خان بالخصوص تنقید کا نشانہ بنے۔مگر خان عبدالصمد خان کی خدمات کے بارے میں کھوسو کا محض ایک فقرہ ہی ایک سند کا درجہ رکھتا ہے:

''عبدالصمد خان بلوچستان میں نہ ہوتا تو پھر کوئی مخالفت کرے یا موافقت اسی قوم بلوچستانی کو گورنری قطعاً نہیں مل سکتی تھی''......

مگر غلط فہمیاں تو پیدا ہو چکی تھیں۔لوگ باز نہ آرہے تھے۔خان عبدالصمد اختلافات کو بہت دور لے جا کر خود کو اچھا خاصا متنازع بنا چکے تھے۔مگر کھوسہ صاحب تو پرانے صمد خان کو جانتے تھے۔قربانیاں دینے والے صمد خان کو۔بلوچ کی آواز صمد خان کو۔چنانچہ ملک فیض یوسف زئی کے نام اپنے خط میں کھوسو صاحب نے خان کے بارے میں لکھا تھا: ''اسے بلوچستان سے پیار ہے۔وہ بلوچستان پر عاشق ہے۔مجھے صمد خان کی ایمان داری پر یقین کامل ہے''۔(18)۔مگر باہمی اختلافات

اور اُن اختلافات سے نمٹنے کا خان کا طریقہ انہیں اپنے دوستوں سے بہت دور لے گیا............ایک بہت ہی متنازع انتہا تک۔ ایسے اختلافات کہ منطق، دلیل، عقلِ سلیم کچھ کام نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ کھوسو صاحب بھی تھک ہار کر جھنجھلا اٹھے۔ مگر وہ خان کی سیاست سے شدید اختلافات رکھنے کے باوجود یہ پیار بھرا فقرہ لکھتے ہیں: ''بلوچستان کی سیاست کا یوسف اعظم کی قبر کے ساتھ میں ہی معمار ہوں۔ میرا مشورہ خان عبدالصمد خان کو تا امروز یہی ہے کہ وہ اپنی سیاست کو اپنے بھولے اور بچھڑے ساتھیوں کے ساتھ ملا لے۔ میں خان عبدالصمد خان کو تنگ کرنا نہیں چاہتا، جو اس کی مرضی'' (19)۔ اب اِس سے زیادہ پاک دوستی اور اس دوستی سے مایوسی کی کوئی اور سرحد دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

اسی طرح بزنجو، بگٹی اختلافات کے زمانے میں محمد امین کھوسہ دونوں سے تعلقات رکھنے کے باوجود اپنے مؤقف پر سختی سے کار بند رہے۔ سیاسی ورکر زیادہ تر بزنجو صاحب کی طرف تھے۔ وہ امین کھوسو پہ شک کا اظہار کرنے لگے کہ وہ اکبر بگٹی کے پاس بھی جاتے ہیں اور بزنجو کے کیمپ میں بھی۔ لہٰذا وہ گویا بزنجو کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ ذرا دیکھیے امین کھوسہ کا جواب: ''غوث بخش بزنجو اور میرا باہمی تعلق کیا ہے؟ میرا اسکھلایا ہوا نوجوان!۔ میں اپنے ہی تربیت یافتہ کے خلاف سوچوں؟ یہ تو ایسا ہوا جیسے غوث بخش اپنے (بیٹے) بیزن کے خلاف منصوبہ کرے!۔ نا بابا نا! یہ سیاست نہیں یہ پسر کشتن ہے۔ مجھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اوروں کے ساتھ میرے تعلقات منقطع ہو گئے ہیں۔ نہیں ان سب کو بھی میں عزیز رکھتا ہوں، درجہ بدرجہ۔ میں خانہ جنگی کو فروغ دینے والا کیسے بن سکتا ہوں...... میں اگر نواب محمد اکبر خان جس کی میں بہت توقیر کرتا ہوں، اس کے ساتھ مل کر غوث بخش خان بزنجو کے خلاف دورہ کروں تو مجھے خود شرم آتی ہے''۔ (20)......

ایسے تھے ہمارے اکابرین۔ ایسے تھے ہمارے راہبر۔ کون کہتا ہے کہ بلوچ بدقسمت ہیں؟!

جیسے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ 1960ء اور 1970ء کی دہائیاں بلوچستان میں بدترین سیاسی پولرائزیشن کی دہائیاں تھیں۔ بلوچستان کے تمام با اعتبار و باوقار سیاسی رہنما باہم بٹ چکے تھے۔ دوستیوں نے مخالفتوں کی بھیانک شکل اختیار کی تھی۔ بدگمانیاں ہر فعل اور ہر قول پہ حاوی ہو چکی تھیں۔ میر امین کھوسہ اِن متحارب لیڈروں کے بیچ مصالحت کے لیے صفا مروہ کرتے کرتے تھک

چکے تھے۔ ہر شخص انہیں دوسرے کا آدمی سمجھتا رہا۔ کھوسہ ایک بوڑھا سیاسی ورکر، کس کس الزام کا جواب دے پاتے؟ ہانپتے ہانپتے بھاگتے دوڑتے اور بہت ہی ہتک آمیز الزامات کا جواب دیتے دیتے بالآخر وہ کہنے پر مجبور ہوئے:

''میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں احسان فراموش نہ کرنے والا پرانی وضع کا بلوچ ہوں۔ میں نے سیاست کا سبق تو عام کیا، لیکن بلوچی رواداری کیا ہے اور کس طرح قبائل اندرونی آزادیاں رکھ کر ایک دوسرے کا احترام کریں، یہ سبق ابھی تک میں نے کسی کو نہیں دیا۔ لیکن میری سیاست کا بنیادی ستون حق پرستی بھی ہے۔ تو میں یکسو گوشہ نشین ہو گیا۔ باطل پرستی مجھ سے ہو نہ سکی''۔

کھوسو صاحب اپنی عمر کے آخری حصے میں ایک اچھی سیاسی تحریک نہ پا کر، اپنے ساتھیوں کے مابین سیاسی اختلافات اور باہمی رنجشیں سلجھانے میں مکمل طور پر ناکام ہو کر چُپ تو ہو ہی گئے مگر پیرانہ سالی بھی ساتھ آئی تو سب نے مل کر انہیں ایک عجیب پلٹا کھلوایا۔ وہ یک دم روحانیت میں چلے گئے۔ اور اپنی زیادہ مذہبی محبت کے سبب پیر پرستی میں لگ گئے ......ان کے بہت اچھے دوست عبدالصمد خان اچکزئی لکھتے ہیں: ''پیر چونڈی کے بڑے سخت مرید ہیں۔ وہ انہیں بہت مانتے ہیں اور بہت پیسہ خرچ کرتے ہیں......'' (21)

اسی پیر پرست امین کھوسو کے بارے اُن کے ''میٹھے دوست'' عبدالصمد خان اچکزئی یوں کہتے ہیں: ''اس کے باوجود کہ میں پیروں اور پیری کو اسلام اور مسلمانوں کی بربادی کا اولین اور سب سے بڑا سبب گردانتا ہوں۔ اور وہ اپنے پیر کو اسلام کا ستون اور پیری کو خدا نہیں تو پیغمبری کا ایک حصہ مانتے ہیں۔ جب ہم ملتے ہیں تو اس موضوع پر ہمارا بہت سا وقت ضائع ہوتا ہے۔ لیکن میرا ان سے بہت پیار ہے۔ ان کی باشعوری اور سچائی کو تسلیم کرتا ہوں اور بہت پسند کرتا ہوں۔'' (22)

یہ عظیم انسان 5 دسمبر 1973ء کو رات آٹھ بجے کراچی میں انتقال کر گئے۔ ہزاروں اہالیانِ بلوچستان و سندھ ان کے جنازے میں شریک تھے۔ گورنر بلوچستان نواب اکبر بگٹی بھی گئے تھے۔ میر محمد امین کھوسہ 6 دسمبر 1973ء میں اپنے آبائی گاؤں گوٹھ عزیز آباد، ضلع جیکب آباد میں دفن ہوئے۔

حوالہ جات

1۔شاہد حسین ،سردار محمد امین کھوسو۔1991۔مجلس یادگار محمد امین کھوسہ۔کراچی۔صفحہ 148

2۔بگٹی ،محمد اکبر خان۔تعزیتی بیان۔بلوچستان کے تمام اخبارات

3۔اچکزئی ،عبدالصمد۔زما ژوند او ژوندون............جلد نمبر 2۔صفحہ 397

4۔گیانچندانی ،سوبھو۔سندھ کے چند انقلابی دانشور.......۔1998 الفاظ پبلی کیشنز۔لاہور صفحہ 24۔

5۔عبدالرسول نظامانڑیں کے ساتھ انٹرویو سنگت

6۔ایضاً

7۔شاہد حسین۔سردار محمد امین خان کھوسہ۔1991 مجلس یادگار محمد امین خان کھوسو۔کراچی۔صفحہ 49

8۔شاہد حسین۔سردار......صفحہ 81

9۔عبدالرسول نظامانڑیں کے ساتھ انٹرویو سنگت

10۔ اچکزئی ،عبدالصمد خان۔زما ژوند او ژوندون۔جلد نمبر 2۔صفحہ 396

11۔کھوسو صاحب کا خط پروفیسر محمد سرور کے نام۔شاہد حسین۔سردار............صفحہ 127

12۔ شاہد حسین۔سردار......۔صفحہ 128

13۔ کھوسو صاحب کا غلام ربانی آگرو کو خط۔شاہد حسین کی کتاب۔سردار......صفحہ 141

14۔ شاہد حسین۔سردار......کھوسو ،محمد امین۔ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو کو خط۔ سردار......صفحہ 144

15۔کوثر ،مکاتیب۔صفحہ 36

16۔ شاہد حسین۔سردار......صفحہ 69

17۔اچکزئی۔عبدالصمد۔زما ژوند............جلد نمبر 3 صفحہ 211

18۔یوسف زئی ،ملک فیض محمد۔یادداشتیں۔1997۔پی ڈبلیو اے ،بلوچستان۔صفحہ 195

19۔شاہد حسین۔سردار......صفحہ 122

20۔شاہد حسین۔سردار......133

21۔اچکزئی۔عبدالصمد۔زما ژوند............جلد نمبر 2۔صفحہ 397

22۔اچکزئی۔عبدالصمد۔زما ژوند............جلد نمبر 2۔صفحہ 3971

خان عبدالصمد خان اچکزئی

(سات جولائی 1907۔دو دسمبر 1973)

اگر گاندھی پہ ہندوستان نازاں
صمد پہ ہے بلوچستان نازاں
نوازش سے تری مجھ کو یقیں ہے
اٹھے گا خطہء نادان نازاں

عنقا

ایک ایسے سماج میں خان عبدالصمد خان اچکزئی کے بارے میں بات کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جہاں نظریات ثانوی معاملہ ہو چکے ہوں۔ممبری ، اسمبلی ، کوٹہ ، وزارت ، کوئٹہ تیرا یا میرا ' ابھر کر سامنے آ چکے ہوں۔ایک ایسے معاشرے میں خان کی کیا تعریف کی جائے جہاں اسے صمد خانی گز سے نہ ناپا جائے ، بلکہ اپنی مخصوص نسلی عینک سے دیکھا جاتا ہو۔ایسے معاشرے سے کیا بات کی جائے جو اس بڑے آدمی کے 65 سالوں کی کھری اور محنت و مصیبت بھری جدوجہد کے بجائے صرف اس کی زندگی کے آخری تین سال کی ردِ عملی ، بالکل الٹ اور کمپرومائزوں کی سیاست پر مشتمل عرصے کی ....حقائق خود فتوؤں کی زد میں ہوں تو حقائق کا راوی تو بہت آزمائشوں کی لہروں کے تھپیڑوں کا شکار ہوگا ہی۔اسی تین سالہ سیاست کی تقریب یا ماتم منانے کے عادی سماج میں اس کے بارے میں

بات کرنا خود کو متنازع بنانے کی بات ہے۔اور ایسے معاشرے کے لیڈروں سے کیا بات ہوسکتی ہے جن کی بدولت عبدالصمد خان کی عظمت بیان کرنے کے لیے بھی' جواز پیش کرنا پڑے۔

مجھے یاد ہے کہ ستر کی دھائی کے اوائل میں کوئٹہ کے قندہاری بازار' جناح روڈ اور اُن دونوں سڑکوں کے سنگم پر تقریباً ہر شام ایک نسبتاً چھوٹے قد والا، جسیم اور معمر شخص نظر آتا تھا، سرخ سفید رنگت والا......وہ کبھی اکیلا ہوتا اور کبھی کسی کے ساتھ۔اس کی مشین دی ہوئی سفید داڑھی تھی، کھدر کے موٹے کپڑے پہنے ہوتے، کندھے پر چادر رکھی ہوئی ہوتی، بغیر کسی بناوٹ، اکڑ یا تصنع کے۔کبھی بلند قہقہہ لگانا، کبھی چلتے میں دوسرے ساتھی کے کندھے پہ بے تکلفی سے ہاتھ مارنا......(قہقہہ لگانے والا ہمیشہ بہت ہی نرم دل والا ہوتا ہے۔اپنے دکھ، اپنے احساسات پہ ہمہ وقت قہقہوں کی استری پھیرتا ہوا' اپنے غم لوگوں سے چھپاتا شخص!!)۔اس کے بارے میں لوگوں کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی رائے تھی کہ''وہ کانگریسی ہے، ہندوؤں کے دھرم کا پیروکار ہے، بھارت کا ایجنٹ ہے، اسے ہندوستان سے تھیلے بھر بھر کر پیسے ملتے ہیں، اس کے پاس ٹیوٹا جیپ ہے جب کہ دوسرے لوگ بے چارے......'' چنانچہ اس کے قریب سے گزرنے میں ہی بندہ گناہ گار ہوجاوے۔

یہ عبدالصمد خان تھا۔عدم تشدد والا، گاندھی کا پیروکار، یوسف عزیز مگسی کا ساتھی......

یہی وہ زمانہ بھی تھا جب خان کو سیاست کے ذریعے بہت''چھوٹا'' بھی بنایا گیا۔بورژوا سیاست بہت سفاک ہوتی ہے، بے روح، سنگ دل اور غیر انسانی۔چنانچہ صمد خان کو مخالفوں نے تو قابلِ نفرت بنایا ہی تھا، اپنوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔میں آج دعوے سے کہتا ہوں کہ خان عبدالصمد خان اچکزئی بلوچوں کا سب سے طویل، بلند آہنگ اور معتبر ترجمان رہا۔ذرا سا اختلاف کیا آیا کہ ہم نے اسے خود سے باہر پٹخنے کا گناہِ کبیرہ کرڈالا۔اسی طرح اس کی سیاسی پارٹی نے بڑے پہاڑ جیسی شخصیت کو اپنی سیاست کے مفاد میں محض اپنی قومیت کے ہیرو تک محدود کرڈالا۔میرا ایمان ہے کہ جب بلوچ اپنے واک واختیار کی جنگ جیتے گا، اور پھر زندگی کے اگلے پڑاؤ میں داخل ہوگا تو خان کو دوبارہ دیکھا جائے گا، اس کے مقام کا ازسرِ نو احیا کیا جائے گا اور اسے بلوچ اور

بلوچستان کے اکابرین کی متبرک صف میں دوبارہ جلوہ افروز کیا جائے گا......کفارہ؟۔وہ تم ہم بھگت چکے ہیں اِن پچاس برسوں میں۔

ستر کی دہائی کے شروع میں، میں سید مطلبی فرید آبادی کا ہفت روزہ''عوامی جمہوریت'' پڑھتے پڑھتے، اور سیاسی کام کے نتیجے میں نیپ بھاشانی میں باقاعدہ بھرتی ہوچکا تھا۔میں خالد خان، مرحوم عبدالرحیم (زیارت والے) اور عبدالرحیم ایڈووکیٹ سے متعارف ہوا۔اور سیاسی انسان بنتا گیا۔کرشن چندر کے ناول''غدار'' اور خلیل جبران کے''پکار'' نے میری دنیا ہی بدل ڈالی۔بہت بعد میں سائیں کمال خان شیرانی سے نیازمندی پائی۔مگر اس سب کے باوجود میں پشتونخوا نیشنل عوامی پارٹی (صمد خان گروپ) سے یاری نہ بنا سکا تھا۔البتہ وہ جو Inhibitions تھے کانگریسیوں کے خلاف اور ہندوؤں کے خلاف، وہ بہت کم ہوگئے اور اس طرح خان عبدالصمد خان سے بھی کوئی خاص مخاصمت نہ رہی۔

تین چار سال اسی آنکھ مچولی میں گزر گئے کہ سردیوں کی ایک صبح بولان میڈیکل کالج کے پرانے ہاسٹل میں اخبار پڑھتے ہوئے اسے بم سے اڑائے جانے کی خبر پڑھی۔مجھے سچی بات ہے، کہ اس وقت بھی اس کی عظمت اور بڑائی کا کوئی ادراک نہ تھا، اس لیے کہ بڑی دھند اور غبار پیدا کیا گیا تھا ان کی شخصیت کے گرد۔

اُس کی سوانح حیات بھی بہت دلچسپ رہی۔وہ خود یوں لکھتا ہے:''بزرگوں کے بقول میں 1907ء کے 7 جولائی کو پیدا ہوا۔میں اچکزئی، حمید زئی، جلے زئی اور برخوردار خان کے خاندان سے ہوں......میں گلستان میں ناتولا (عنایت اللہ) کاریز نامی گاؤں میں پیدا ہوا......میری ماں کا نام''دلبرہ'' تھا۔اور میرا والد نور مامد خان ہے۔دادا سولتاں مامد خان تھے جن کے والد کا نام ناتولا خان تھا، جن کے نام پر ہمارا گاؤں ہے۔ان کا والد بوستان خان، برخوردار خان کے بیٹے تھے جن کے نام سے ہمارا خاندان جانا جاتا ہے''۔(1) کہتے ہیں کہ برخوردار خان احمد شاہ کا ہم عصر اور اس کا اہم جرنیل تھا۔بوستان خان بھی ایک کمانڈر تھا۔

دس برس کی عمر میں خان کا والد فوت ہوگیا۔اس کی ساری پرورش ماں نے کی۔ایسی

اچھی پرورش کہ نہ صرف اُس کم سن کو یتیمی محسوس ہونے نہ دی۔ بلکہ اُس مہان خاتون نے اپنی ممّتا نما گود میں ایک یتیم کو' عبدالصمد خان بنا دیا۔ دلبرہ بی بی کے والد اور خان کا نانا محمد حسن خان بھی بہت اہم ہے کہ اس نے کسی بادشاہ کا ساتھ نہ دیا بلکہ سامراج دشمنی کی راہ اپنائی اور' غازی محمد ایوب کے ساتھ میوند کی لڑائی میں حصہ لیا تھا۔(2)

خود خان کا والد نور محمد خان ایک علم دوست شخص تھا۔ خان نے اپنے والد اور ملاؤں سے دینی تعلیم حاصل کی۔ پشتو، عربی اور فارسی سیکھی۔ اس کے علاوہ فقہ، حدیث وتفسیر اور دوسرے مذہبی مضامین کی تعلیم حاصل کی۔

1918ء میں جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو وہ دس برس کا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب شہنشاہی روس میں مزدوروں نے دنیا کی ایک انوکھی اور نرالی تبدیل کرڈالی۔ وہاں سوشلسٹ انقلاب ہوا۔ اس انقلاب کے اثرات زبردست تھے۔ یہی زمانہ افغانستان میں امان اللہ خان کی سامراج دشمن اور روشن فکر حکمرانی کا بھی تھا۔ اِن دونوں مظاہر نے ننھے صمد خان کے اجلے دل ودماغ پہ زبردست اثر ڈالا۔

سیاست کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ صمد خان نے سکول کے زمانے میں ہی گلستان میں ایک جلوس نکالا۔ وہ 1920ء میں تیرہ برس کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گلستان کے مڈل سکول میں داخل کرادیا گیا۔ چوں کہ تعلیمی بنیاد مضبوط تھی، اس لیے براہِ راست تیسری جماعت میں داخل ہوا۔ پرائمری میں اول آیا تو چار سال تک وظیفہ منظور ہوا۔ 1925ء میں مڈل کا امتحان دے کر پاس ہوگیا۔ گویا اس نے چار سال کے اندر اندر آٹھ جماعتیں پاس کرلیں (3)۔ تعلیم سے فارغ ہوکر وہ کاروبار میں لگ گیا۔

عبدالصمد خان اچکزئی کی سیاسی اٹھان کے سلسلے میں دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اس کی بلوغت کی عمر میں روس میں سوشلسٹ انقلاب آچکا تھا اور دوسری یہ کہ افغانستان میں امان اللہ خان جیسا روشن فکر اور سامراج دشمن حاکم موجود تھا۔ وہی امان اللہ خان، جس نے افغانستان میں تعلیم اور جمہوری اداروں کی بنیاد رکھی تھی، جس نے عورتوں کے لیے تعلیم کے

دروازے کھول دیے تھے۔ امان اللہ خان عبدالصمد کے علاقے چمن وپشین ہی کے راستے سے گزر کر یورپ کے دورے پر گیا تھا۔

تعلیم کے بعد اُس زمانے میں سر رابرٹ سنڈیمن کی بساط پر خطرناک ترین چال' لیویز کی نوکری ہوا کرتی تھی۔ جس میں علاقے کے اکثر قبیلوں کے سربراہ پھنس چکے تھے۔ مگر خان نے سرکاری نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں انگریز کی اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا جو کرنل پارسنز کے دور میں اسے چمن کا ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنانے کے لیے کی گئی تھی۔(4) اور یہ عہدہ انگریز کے دور میں بہت بڑا عہدہ ہوا کرتا تھا۔(بلکہ ابھی حال تک ون یونٹ بلوچستان میں اے سی' بادشاہ ہوا کرتا تھا)۔

خان کے اولین سیاسی رفقا میں اس کا بڑا بھائی ایوب خان، عبدالغفار خان، محمد طاہر خان، اسمٰعیل خان، محمد قاہر خان اور عبیداللہ خان شامل تھے۔

شادی کے سلسلے میں یہ دلچسپ تذکرہ ضروری ہے کہ خان نے دوہزار روپے لب (ولور) دے کر شادی کی تھی۔(5) ذرا حیران ہوجایئے کہ اس شخص کی کل زندگانی 65 برس تھی۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی ہوگی۔ اس طرح بقیہ زندگانی رہ گئی 45 برس۔ اِس 45 برس میں وہ 28 برس جیل میں رہا تو اُس عورت پر کیا بیتی ہوگی، جس سے اس کی شادی ہوئی۔ نہ وہ بیوہ ہے نہ وہ دلہن ہے۔ نہ وہ زندہ ہے نہ وہ مردہ ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی چہ می گوئیاں ہیں، خاوند پہ طرح طرح کی تہمتیں ہیں، ہم عمر عورتوں کا تیل صابن والا چہرہ ہے، شادیاں عیدیں شادمانیاں ہیں اور صمد خان کی محترمہ زوجہ آہوں سسکیوں میں زندہ اپنے خاوند کے لوٹنے کی منتظر۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کس طرف رخ کرکے بیٹھے، جانے کس سمت سے اس کا مجازی خدا رہا ہوکر آئے۔

ہمارے سیاسی اکابرین کی زوجاؤں پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر خان کے زمانے میں انسانی حقوق والی انجمنیں ہوتیں تو خان پر تو مقدمہ چلایا جاتا۔ ہمارے سب بزرگوں کو وطن کی آزادی نے برباد کیا مگر اُن کی قربانیوں کی سب سے بھاری اور تباہ کن قیمت تو اُن کی ازواج کو سہنی پڑی۔ اُن سب کا پاک مشن چلا ہی اُن کی عزیز ترین رفیقہ حیات کی بے کنگھی کیے بالوں کی

قیمت پر۔ خان کو تو چھوڑیے، کہ وہ خودستائش سے دور تھا۔ مگر آج پچاس برس بعد بھی ہم گوادر سے لے کر قمبر پل تک اور ہلمند سے لے کر چاڑ کا تک کے لوگوں نے اپنی اِن ماؤں دادیوں کے لیے ایک کلمہِ خیر تک نہ کہا۔

اُس خاتون کی جوانی والی نیم بیوگی کے علاوہ بھی، اُس کے مبارک حصے میں ایک اور بڑا کارنامہ آیا ہے۔ اُس نے تربیت کرکے صمد خان کو، اور اِس وطن کو لائق، قابل اور باعمل اولاد دی۔ اگر آج ہم نے صابرہ اماں کی قومی قربانیوں کا تذکرہ کیا ہے، بعید نہیں کہ کل اُس کے نام کی ایک سڑک کردی جائے، ایک عمارت کردی جائے یا ایک شہر ہوجائے۔ (نہیں جی، یہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ اِس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن 2009ء میں چھپا تھا۔ یعنی چار پانچ سال قبل ہی ہم نے یہ مطالبہ کیا تھا۔ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اب کون پرواہ کرے گا؟)۔

خان سرگرم سیاست میں 1920ء کی دہائی کے اواخر میں کود پڑا۔ 1929ء میں جب لاہور میں کانگریس، خلافت، نوجوان بھارت سبھا اور کیرتی کسان کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے تو خان اپنے دو ساتھیوں قاضی محمد قاہر خان اور عبیداللہ جان کے ہم راہ لاہور گیا اور ان تنظیموں کے اجلاس دیکھے۔ مقررین میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور کاصنوبر حسین مومند کی تقریریں انہیں بے حد پسند آئیں۔ یہیں اس نے اندازہ کرلیا کہ ایک ایسی جماعت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا جس میں بے لوث خدمت کرنے والے موجود ہوں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کے علاقے میں نہ تو اجلاس کرنے کی رسم تھا اور نہ تقریریں کرنے اور جماعت سازی کی کوئی ریت تھی، اور نہ ہی عوام کو منظم کرنے کا اس کا اپنا کوئی تجربہ تھا۔ اسے یہ کام بالکل الف بے سے شروع کرنا تھا۔

گھر واپس آکر سارا حال محمد ایوب اچکزئی اور اپنے بھائی عبدالسلام سے بیان کیا۔ یہ تینوں ساتھی تھے، انہوں نے مل کر سیاست کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر فوراً ہی سرکار نے تینوں کو گرفتار کرلیا۔ خان کی پہلی بار کی یہ گرفتاری 1929ء میں ہوئی۔ اس پورے علاقے کے لیے سیاسی جیل ایک نئی بات تھی۔ لوگ حیران تھے کہ خان، اس کے بڑے بھائی حاجی عبدالسلام خان، محمد ایوب خان اور عیسیٰ خان نے کیا جرم کیا تھا؟ چوری، ڈاکہ، رہزنی، قتل، دنگا لڑائی......؟ وہ اس بات پہ حیران

ہوئے کہ سیاست بھی جرائم میں سے ایک تھی!!

ان سب قیدیوں کو کوئٹہ لایا گیا۔ اُس وقت بلوچستان کے آسمانوں کی وسعتوں کا ایک اور درخشندہ ستارہ، مستونگ جیل میں بند تھا۔ اور وہ بھی سیاست کرنے ہی کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ وہ جلیل القدر انسان تھا: میر یوسف علی خان مگسی۔ مگسی صاحب کو جب خان عبدالصمد اچکزئی کی، سیاست کے جرم میں گرفتاری کا پتہ چلا تو اس نے فوراً ہی ایک پر جوش نظم لکھ ڈالی۔ دوسری طرف خان نے بھی جب ایک اور سیاسی قیدی کی خبر سنی تو، اس کے اپنے الفاظ میں، ''ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ چلو خیر سے ایک اور ساتھی بھی مل گیا۔ یہ محترم (یوسف عزیز مگسی) میری آئندہ زندگی میں میرا سیاسی رفیق اور بلوچستان کی قومی زندگی کا ایک عظیم اور بڑا لیڈر بنا''۔

کوئٹہ میں خان صاحب اور اس کے ساتھیوں کو شاہی جرگے نے دو دو سال کی قید سنائی۔ یہ سزا پوری کرکے خان 1931ء میں رہا ہوگیا۔

دلچسپ تھے یہ لوگ بھی۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو جو خان بدالصمد خان اچکزئی، یوسف عزیز مگسی اور میر عبدالعزیز کرد کی رفاقت کی گہرائی، گیرائی کو واضح کردے گا:

''ہم نے نہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور نہ ہی ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے، اور نہ ہی ہم میں کوئی جماعتی وابستگی تھی۔ مگر ایک دن اچانک ''زمیندار'' اخبار میں ان کا ایک بیان آیا کہ ''پندرہ دن بعد فلاں روز بلوچستان میں اصلاحات کے لیے 'یوم بلوچستان' کے نام سے کام شروع ہوگا اور کوئٹہ میں ایک جلوس نکلے گا۔ اس جلوس کی راہنمائی مولانا عبدالصمد خان بی۔ اے کریں گے'' ۔(میں نہ مولانا تھا اور نہ بی اے، مگر عبدالصمد تھا۔) میں سمجھ گیا کہ ان کا مطلب 'میں' تھا۔ اسی روز میں نے میر عبدالعزیز کرد کو تار دے دیا کہ صبح کوئٹہ پہنچیں۔ اگلے دن عصر کے وقت وہ اور ان کا چچا زاد بھائی میر حاجی خان، صمد خان کے ساتھ سنڈیمن ہال کے بڑے چمن میں بیٹھے اور اس بات پر غور کیا کہ یوسف علی خان نے یہ کیسا اعلان کردیا؟۔ بلوچستان میں ابھی تک قومی پارٹی کہاں ہے؟ قوم دوست ساتھی کہاں ہیں؟۔ اس بے کسی اور در بہ دری میں یومِ بلوچستان کا مطلب کیا ہوگا؟......مگر اب جیسا بھی ہے ایک قوم دوست شخص نے ایک پرائے علاقے سے پکارا تو اب تو یہ ہو کر ہی رہے

گا۔تب ہم نے اپنے ساتھی گنے اور صرف دس آدمی ایسے ذہن میں آئے جو اس کام کے لیے ہر قربانی پہ تیار ہوں گے۔ہم نے پروگرام بنایا اور تیاری میں لگ گئے............''۔

ایسے تھے ہمارے اکابرین!!

جولائی 1931ء میں وہ بمبئی چلا گیا تا کہ لندن گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے جانے والے لیڈروں سے ملاقاتیں کرے اور انہیں بلوچستان کے تکلیف دہ حالات سے باخبر کردے۔وہیں اس کی گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور وہ 15 دن تک اس کے ساتھ رہا۔

بمبئی سے واپسی پر خان زور وشور سے سیاسی کام میں لگ گیا۔اُدھر میر یوسف عزیز مگسی نے ملتان میں بلوچوں کے ایک اجلاس کا انعقاد کیا تھا،جس میں اس نے خان شہید کو بھی مدعو کیا تھا۔وہ شریک تو نہ ہو سکا البتہ ایک خط عزیز مگسی کو لکھ کر اپنی مکمل تائید اسے دے دی۔اس اجلاس میں بلوچستان کے دیگر جاگے ہوئے نوجوانوں کے علاوہ بگٹی بلوچوں کے نواب میر محراب خان بھی شامل تھے۔ملتان کے اس اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ دسمبر 1932ء کے اواخر میں جیکب آباد میں تمام ہندوستان کے بلوچوں کی ایک کانفرنس کا انعقاد ہو۔اسی فیصلے کے مطابق عبدالصمد خان نے بلوچ اینڈ بلوچستان کانفرنس منعقد کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔یہیں پر مگسی اور اچکزئی نامی دو دمکتے ستاروں کی اولین ملاقات ہوئی۔قلات،مستنگ،جیکب آباد اور مگسیوں سے کچھ نوجوان پہنچ چکے تھے جو سب بقول خان،''میری طرح ناآزمودہ نوجوان تھے۔مگر قومی کام کے لیے ہر ایک محبت اور جوش سے بھرا ہوا تھا......تین چار روز کے کم وقت میں،میں اور جناب یوسف علی خان باہم بہت قریب آئے اور شیر وشکر ہوئے اور اُن کی وفات تک میٹھے دوست رہے''(6)۔

غلام قادر بلوچ ایڈووکیٹ کی سربراہی میں استقبالیہ کمیٹی قائم ہوئی۔خان عبدالصمد کی شبانہ روز محنتوں کی برکت سے پرگلستان اور آس پاس سے کافی لوگ تیار ہو گئے جنہوں نے اچھے خاصے پیسے بھی جمع کیے تھے۔اس جلسے کے لیے،''ہم نے کچھ رضا کار بھی مقرر کیے جن کی وردی بلوچوں کے قومی جھنڈے کی طرز پر سرخ قمیص اور سبز شلوار تھی''(7)۔رضا کاروں کا سربراہ خان شہید کا ماموں زاد جناب محمد اسلم خان تھا۔

خاران سے نواب زادہ میر شہباز خان،جام نور اللہ خان اور دیگر کئی بلوچ سرکاری ملازم اس کانفرنس کے لیے آئے تھے۔اس جلسے کی صدارت کے لیے ریاست خیر پور کے نواب میر علی نواز خان تالپور تیار ہو گئے اور جلسے کے لیے اپنی دربار سے بہت سارے خیمے اور چاندی کی کرسیاں، قالینیں اور دیگر سامان دے دیا۔جیکب آباد کے آس پاس سرداروں اور زمینداروں کے جو بنگلے اور گھر تھے،وہ بھی زیادہ تر جلسے کے لیے دیے گئے تھے......مگر جب صدارت کے لیے میر علی نواز تالپور بیماری کے باعث نہ آ سکا تو جام نور اللہ خان نے عبدالصمد خان اچکزئی کا نام تجویز کیا،میر یوسف علی خان نے تائید کی اور یہی فیصلہ ہوا۔اس طرح بلوچ اور بلوچستان کانفرنس کی صدارت خان عبدالصمد خان اچکزئی نے کی۔اُس اعتماد کو سلام جو بڑھ کر عزت وتکریم بنا۔بلوچ ماما ناحق کسی کو اپنا بخار نہیں دیتا،کُل ہند بلوچ اجتماع کی صدارت بغیر وجہ کے کیسے دیتا؟!

اس کانفرنس کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں خان صاحب اپنے احباب کا نہایت احترام سے ذکر کرتا ہے،''میرے عزیز بھائی،دوست اور رفیق کار نواب زادہ میر یوسف علی خان مگسی......''(8)۔اس اولین بلوچ کانفرنس کے بعد خطۂ بلوچستان کی آزادی کے لیے اس کی مسلسل قربانیوں کا دور شروع ہوا۔

کانفرنس کے بعد 1933ء کے اوائل میں خان واپس بلوچستان آ گیا......اور گھریلو کاموں اور زمینداری میں لگ گیا۔''بلوچستان کانفرنس'' والا کام صرف ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاسوں تک تھا جو دو تین ماہ میں منعقد ہوا کرتے تھے۔پہلا اجلاس مگسی صاحب کے ہم راہ سبی میں منعقد کیا۔دوسری میٹنگ کوئٹہ میں ہوئی اور تیسری حیدر آباد میں۔

اسی اجلاس میں حیدر آباد اور سندھ کے لوگوں کی یہ دعوت قبول کی گئی کہ دسمبر میں سالانہ اجلاس حیدر آباد میں منعقد کریں۔چنانچہ دسمبر 1933ء میں بلوچستان کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس حیدر آباد میں بلایا گیا۔خان اس میں اُسی جوش وخروش سے شریک ہوا۔اس کانفرنس میں بلوچستان میں نفاذِ اصلاحات کا مطالبہ دہرایا گیا۔حیدر آباد اجلاس میں اس علاقے کے بڑے بڑے بلوچ زمیندار،جن میں سے کئی بعد میں سندھ اور مرکز کے وزیر اور اعلیٰ وزیر بنے شامل ہوئے۔مثلاً

میر بندہ علی خان تالپور، میر غلام علی خان تالپور۔اس کانفرنس میں قرار پایا کہ جماعت کا آل انڈیا مسلم کانفرنس سے الحاق کیا جائے۔اور مختلف علاقوں میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔

حیدر آباد کانفرنس کے بعد بلوچستان کی حکومت کو اس بات سے کافی پریشانی ہوئی کہ ایک کل ہند تنظیم کی حیثیت سے بلوچستان کانفرنس کی شاخ بلوچستان میں قائم کی جانے والی تھی۔لہٰذا اُس نے نہ صرف عبدالصمد خان کو گرفتار کر لیا بلکہ تمام اہم کارکنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔نواب زادہ یوسف علی خان کو اپنے قبیلے کی سرداری سے برطرف کر دیا گیا۔

1933ء میں وہ علامہ اقبال کی صدارت میں کام کرنے والی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شامل ہو گیا اور اس کی آرگنائزنگ کمیٹی کا ممبر بنا۔

جنوری 1934ء کو کراچی میں خالق دینہ ہال میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں شعلہ بیان نوجوان مقرر عبدالصمد خان نے بلوچستان کی زبوں حالی، ظلم وستم، جرگہ سسٹم اور نفاذ اصلاحات کے مسئلہ کو مدلل طریقے سے بیان کیا اور حکومت ممبئی سے مطالبہ کیا کہ بلوچستان کو بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات دی جائیں۔ان کی اصلاحات کی تجویز کے بعض نقاط یہ تھے:

* بلوچستان میں تحریر وتقریر کی آزادی دی جائے۔جلسہ عام منعقد کرنے اور اخبار نکالنے کی آزادی ہو۔
* تعلیم عام کی جائے۔پرائمری اور مڈل سکول قائم کیے جائیں۔
* کوئٹہ میونسپل کمیٹی کی نامزدگی کی بجائے عام انتخابات کے ذریعے منتخب نمائندے مقرر کیے جائیں۔بڑے بڑے شہروں میں لوکل بورڈ قائم کیے جائیں۔
* عام قانون رائج کیا جائے۔عدالتیں قائم کر کے مروجہ قوانین کے تحت مقدمات کے فیصلے کیے جائیں۔
* ہر سرکاری اعلیٰ محکمہ کا علیحدہ علیحدہ افسر مقرر کیا جائے۔پولیٹیکل آفیسر، جوڈیشل افسر اور افسر مال ایک شخص کو نہ بنایا جائے۔
* سرکاری طور پر دیہاتوں سے بیگار لینا اور سڑکیں وغیرہ بنوانا بند کیا جائے۔

* مالی کا یکساں نظام قائم کیا جائے۔2/5,2/7 اور 1/3 کی تخصیص ختم کی جائے۔
* عدالتوں میں جرح اور اپیل کا حق دیا جائے۔(9)

کراچی سے واپسی پر عبدالصمد خان اچکزئی کو 29 جنوری 1934ء کو گرفتار کر لیا گیا۔الزام یہ تھا کہ اس نے بلوچستان سے باہر کے اخبارات میں مضامین شائع کرائے اور کراچی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کی۔چنانچہ سزا پانچ سال اور جگہ مچھ جیل۔(تمہیں سلام ہو!)۔اپنی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا:''بلوچستان کے رسوائے عالم طرزِ حکومت کے خلاف اور بدنصیب بلوچستان کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کے لیے کراچی میں جو پبلک جلسہ ہوا تھا اور بلوچستان کی مستقل اخلاقی حمایت کے لیے ہندو، مسلم، پارسی زعما کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی، وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں غالباً پہلی مثال ہے۔مگر قصرِ استعمار کی بوسیدہ بنیادوں کے لیے یہی کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔اس وقت مجھے بعض احباب نے کہا کہ اس کے بعد اربابِ استبداد کا سراسیمہ ہونا یقینی ہے اور اس کی سراسیمگی کا پہلا وار میری گرفتاری کی صورت جلد نمودار ہوگا۔لیکن میں حکومت کو اس کی اس قدر غلطیوں کے باوجود بھی صرف خطا کار خیال کرتا تھا، بے وقوف نہیں۔میں سمجھتا تھا کہ حکومت اس قدر وسیع اور بار بار کے تجربوں کے بعد اس حقیقت کو سمجھ گئی ہوگی کہ دنیا میں نوخیز تحریکوں کو مظالم کی کھاد اور قربانی کا خون حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بڑھایا کرتا ہے۔مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔سب سے پہلے حکومت نے میرے رفیق اور بلوچستان کے مخلص کارکن میر عبدالعزیز کو گرفتار کر لیا اور اس کے بعد مجھے گرفتار کر کے لے گئی۔اگرچہ میں اپنے پیچھے کوئی زیادہ وسیع اور منظّم تحریک چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ حکومت کے مظالم کا یہ سلسلہ جیسے کہ توقع ہے اگر جاری رہا تو میرے وطنی بھائی جواب تک خفتہ یا نیم بیدار ہیں، اپنے بسترِ راحت کو اس آنے والے طوفان سے محفوظ نہ پا کر جاں نثارانِ وطن کے ساتھ شامل ہوں گے''۔

اس کے ہم دم اور معاون میر عبدالعزیز کرد کو بھی گرفتار کر کے اسے مستونگ کے جرگے سے پانچ سال کی سزا سنوا دی گئی۔جب کہ ای اے سی پشین کی عدالت نے جرگہ کی تجویز پر خان کو

تین سال قید کی سزا دی۔ دونوں رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد ان کے رفقا نے جدوجہد جاری رکھی۔

میر یوسف عزیز مگسی کی ہدایت پر پیر بخش نسیم تلوی نے کراچی سے ''بلوچستان جدید'' کے نام سے یکم مارچ 1934ء کو ہفت روزہ نکالا جس کا معاون و مدیر محمد حسین عنقا مقرر ہوا۔ اس نے ان گرفتاریوں کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ میر عبدالعزیز کرد نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ اسے اور خان عبدالصمد خان اچکزئی کو یکے بعد دیگرے قید بامشقت کی سزا دے کر مچھ جیل منتقل کیا گیا۔ جیل کے اندر ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیرکوں میں رکھا گیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ وہاں انہیں خوراک اور کپڑے بھی سی کلاس کے عام قیدیوں والے دیے جاتے تھے اور مشقت بھی لی جاتی تھی۔ جیل میں قلم کاغذ نہیں دیا جاتا حتیٰ کہ سلیٹ اور سلیٹی بھی نہ دی جاتی۔

وہ ابھی مچھ جیل میں گل سڑ رہے تھے کہ کوئٹہ کا آدم خور زلزلہ آیا۔ ان کا عزیز ترین دوست میر یوسف عزیز اُس بدبخت زلزلے کی نذر ہوا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خان اپنے اس سینئر رفیق اور بھائی کی رحلت سے کتنے دل برداشتہ ہوا ہوگا۔

وہ خود لکھتا ہے: ''دوسرے یا تیسرے دن جناب نظامی کا خط آیا کہ جناب یوسف علی خان بھی زلزلے کی زد میں آ کر فوت ہوگئے۔ نظامی نے نیچے لکھا تھا۔

رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

اس سے میرا دل بہت خراب ہوگیا۔ نظامی کو لکھا کہ وہ ان کی موت کے بارے میں مزید تفصیلات لکھیں اور نیچے میں نے یہ شعر لکھا۔

چوں شمع زندگانی روشن دلاں دمیست
امّا دمے کہ باعثِ احیائے عالمیست'' (10)

بلوچی سیکھی

صمد خان صاحب نے جیل میں قادر بخش بزدار نامی ایک نمبردار سے بلوچی سیکھی جس نے اسے کہا تھا کہ وہ کچھ سمجھے یا نہ سمجھے اس سے بلوچی میں بات کرے۔ اس طرح تین ہفتے بعد وہ بلوچی

میں اچھا خاصا رواں ہوگیا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے وہ بہت اچھی بلوچی بولتا تھا۔(11)

یہاں جیل کے اندر اس نے پرانی اور نئی بڑی چھوٹی اردو فارسی اور عربی سے اٹھارہ تفسیریں دیکھیں۔ مثلاً جلالین، بیضادی، تفسیرِ کبیر مع ان کی شروح وحواشی۔ اسی طرح اس نے غزالی، شاہ ولی اللہ، شبلی، سرسید، ابن خلدون کی ساری کتب، اقبال اور دیگر اردو فارسی اور پشتون شعرا نیز احادیث کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔

جیل سے رہائی

زلزلے کی ہلاکتوں کے باعث 1936ء میں عبدالصمد خان اچکزئی اس شرط پہ جیل سے رہا ہوا کہ وہ تین سال کے لیے نیک چلنی کی ضمانت داخل کرے۔ گویا سیاست کا نام نہ لے۔ مگر انگریزوں کا دبدبہ بلوچستان میں کچھ اس حد تک تھا کہ کوئٹہ شہر سے کوئی معزز و معتبر اُس کی ضمانت کے لیے تیار نہ ہوا۔ چنانچہ مستنگ سے اس کی ضمانت داخل کرنے کا انتظام کیا گیا۔(12)

ذرا رکیے!۔ ہم اُس کی اگلی جنبش و زرمبش سے قبل یہ ضرور دیکھیں گے کہ اُس کی قربانیوں کی کوئی پذیرائی بھی تھی؟۔ اُس کی جیل عوام پہ کیسے گزری تھی، اب رہائی پہ بھی کوئی ردِعمل تھا یا نہیں؟۔ گل خان نصیر ہی تو ہمارا ریکارڈ کیپر ہے، نظم کا عنوان ہے: صمد خان وعبدالعزیز کرد کی رہائی پر۔ نظم کی تاریخ ہے: جون 1636:

پھر شادمان طبقۂ اہلِ وطن ہے آج
پھر ضیغم بلوچ وہ عبدالعزیز کرد
مثلِ گلاب صدر نشینِ چمن ہے آج
عبدالصمد مجاہد ملت اچکزئی
پھر گلستاں میں زینتِ سرو سمن ہے آج

آزادیِ وطن کے لیے سر بہ کف کھڑا
ہر نوجوان اہلِ وطن خندہ زن ہے آج
مصروفِ شعر و شاعری کب تک رہوں نصیرؔ
گلشن میں جا کے دیکھیے کیا بانکپن ہے آج

صحافی صمد خان

1938ء تک بلوچستان میں کسی خودمختار پریس یا آزاد اخبار کا اجرا تو درکنار، پریس ایکٹ ہی نافذ نہ تھا۔اس کے لیے یہاں کے سیاسی کارکنوں نے عبدالصمد خان اچکزئی کی رہنمائی میں متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت سے رجوع کیا اور ہندوستان کی بااثر سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے زبردست مطالبات ہونے لگے۔تب کہیں جا کر یہاں پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا۔

خان نے جیل سے رہا ہوتے ہی ہفت روزہ ''استقلال'' کا اجرا کیا۔جنوری 1938ء میں کوئٹہ سے جاری ہونے والا یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔حیرت کی بات ہے کہ اس دور میں بھی یہ ڈھائی ہزار کی تعداد میں چھپتا تھا۔(آج تو اس بڑی تعداد کے بارے میں کوئی رسالہ مالک سوچ بھی نہیں سکتا)۔عبدالصمد نے اپنے رفیق کار میر یوسف عزیز مگسی کے نام سے ''عزیزیہ پریس'' قائم کیا۔اس نے عزیزیہ پریس کے چھپنے کا سارا سامان لاہور سے خریدا(13)۔اس وقت مکمل پریس پر قریب قریب 10 ہزار روپیہ خرچ آتا تھا۔خان کی اس قدر مالی استطاعت نہ تھی کہ اپنے پیسوں پہ پریس لگاتا۔اور وہ یہ کام کسی ذاتی منفعت کے لیے کر بھی نہیں کر رہا تھا۔چنانچہ اس نے لوگوں سے اپیل کی۔کچھ دوستوں اور بے دار لوگوں کے ذریعے تقریباً ساڑھے سات ہزار روپے جمع ہوئے جس میں سے ''سب سے بڑی رقم دو ہزار روپے اس وقت کے ہز ہائی نس میر احمد یار خان والئی قلات نے دیے تھے۔بقیہ بچے ڈھائی ہزار، اس کے لیے اس بڑے آدمی نے'' اپنی جائیداد کا کچھ حصہ رہن رکھ لیا''(14)۔

اس نے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ عزیزیہ پریس اور استقلال اخبار وقف ہوں گے۔

اخبار کا کام اکثر رضاکارانہ ہوتا۔اس زمانے میں ہاکر، ایجنٹ، نامہ نگار، اور کمپیوٹر وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ پیسہ نہیں تھا۔اس لیے اخراجات بچانے کا دوسرا طریقہ نکالا گیا۔وہ یہ کہ جس روز اخبار چھپتا، تمام ساتھی پریس پہنچ کر اخبار لے جاتے۔کچھ ڈاک کے ذریعے بھیجتے اور جو اخبار کوئٹہ شہر میں تقسیم کرنے ہوتے تھے، وہ سائیکلوں پر سوار ہو کر خود تقسیم کر آتے۔اس اخبار کی ادارت اور سرپرستی شیر محمد غلزئی، محمد حسن نظامی، میر گل خان نصیر، محمد اعظم خان اچکزئی اور عبدالصمد خان اچکزئی اور عبدالصمد درانی نے کی۔اخبار اور پریس کے انتظامات کے لیے ایک نو رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جن میں عبدالصمد خان اچکزئی، میر شہباز خان نوشیروانی، میر محمد امین کھوسہ، عطا محمد مرغزانی، عبدالعزیز کرد، محمد حسین عنقا، محمد حسن نظامی، محمد ایوب اچکزئی اور محمد نسیم تلوی شامل تھے۔

'استقلال' کے کالموں میں انگریزوں کے کالے قوانین اور جرگہ سسٹم کے خلاف مضامین شائع ہوتے۔'استقلال' اخبار نے بلوچستان میں سیاسی تحریک کو سنوارنے میں بڑا کردار ادا کیا۔یہ اخبار بلوچستان میں سیاسی حقوق، عوامی مسائل اور جمہوری اقدار کے لیے آواز بلند کرتا رہا۔بلاشبہ اس نے شعور و دانش کی بڑی خدمت کی۔اخبار سے وابستہ دوستوں کو اندازہ تھا کہ وہ یہ اخبار کیوں اور کس لیے نکال رہے ہیں۔تحریک پیدا کرنے کے لیے آدمی بھی چاہیے ہوتے ہیں، استقلال نے یہی کام تو کرنا تھا۔'استقلال' اخبار نے یہاں کے ثقافتی ورثے، یہاں کی صدیوں پرانی قابلِ لحاظ قدروں کے تحفظ اور یہاں کی مخصوص مثبت روایات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بدلتے حالات میں اپنی ذمہ داریوں سے بہتر طور پر عہدہ برآں ہونے پہ تیار کیا۔اس کے علاوہ تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کے لیے بھی اس اخبار نے تاریخ ساز کردار ادا کیا۔اور تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر حق گوئی کی اور اپنا مافی الضمیر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔''استقلال'' نے صحافت کے اندر لوگوں کو اظہارِ جذبات کے مثبت طریقوں کو اپنانے کی مثال پیش کی۔

انجمنِ وطن

20 مئی 1938ء میں خالص سیاسی بنیادوں پر ''انجمنِ وطن'' کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنالی گئی اور وطن کی آزادی کے لیے منطقہ کے دیگر حریت پسندوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس جماعت کا نصب العین بلوچستان میں آئینی اصلاحات کا نفاذ تھا اور آئینی ذرائع اس کے اصول تھے۔ اس پارٹی کے بنانے چلانے میں بھی مرحوم یوسف عزیز کی روح کام کر رہی تھی۔ کتنا جادو تھا اس شخص کے کردار میں اور کس قدر سحر تھا اس انسان کی شخصیت میں!!۔ 1939ء میں اس کے تین روزہ اجلاس کی صدارتی تقریر میں خان عبدالصمد خان نے کہا'' ...... یہ انجمن جیسا کہ آپ جانتے ہیں مادرِ وطن کے بہترین فرزند مرحوم نواب یوسف علی خان اور ان کے چند مخلص رفقا کے آٹھ سال کی سرفروشانہ جدوجہد کا منظّم نتیجہ ہے''......اس نے یوسف علی خان کو 'یوسفِ اعظم'' کہا تھا۔ انجمن کا واحد مقصد انگریز کو وطن سے نکال باہر کرنا تھا۔ اس کے عہدیداروں میں اچکزئی صاحب صدر، محمد حسین عنقا جنرل سیکرٹری، ارباب عبدالقادر سیکرٹری، اور سیٹھ ڈونول خزانچی تھے۔(15) اس کے علاوہ میر محمد امین کھوسہ، حسن نظامی، میر شہباز خان نوشیروانی، وڈیرہ محمد خان کھوسہ، ملک شیر محمد خان غلزئی، میر ولی محمد خان مرغزانی، سردار دیال سنگھ، مولوی غلام حیدر، جام میر نور اللہ خان اور دیگر کئی انسان دوست اور محبِّ وطن اکابرین، اس میں سرگرم تھے۔

انجمنِ وطن نے رجعت پرستوں، سرداروں، مسلم لیگیوں، انگریز وفاداروں، ٹوڈیوں، جرگہ ممبروں اور دین فروشوں کے خلاف کھلی لڑائی لڑی۔

انجمنِ وطن، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی اور جمعیت علمائے ہند تینوں ہندوستان کی سیاست میں انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کرتے تھے۔ 1942ء میں انجمنِ وطن' کانگریس میں ضم ہوگئی۔

بڑے عجیب لوگ تھے وہ، بڑی عجیب دوستیاں رکھتے تھے۔ صمد خان اپنے رفیق جام نور اللہ سے بدظن ہوا۔ صرف ایک جھلک دیکھیے:

''1944-45ء میں اخبار میں پڑھا کہ سرکار نے جام نور اللہ کو 'خان صاحب' کا خطاب دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا کہ ایسے وقت میں یہ کیسے ہوا جب کہ انگریزی سرکار جارہی ہے اور ہندوستان

آزاد ہو رہا ہے تو اس نے ایسا کیوں کیا؟۔ میں نے انہیں ایک خط لکھا...... کہ یہ انہوں نے کیا کیا؟ مگر افسوس خط پہنچنے سے قبل ہی ان کا انتقال ہو چکا تھا...... اس سے دس برس قبل میرے ایک اور باشعور، مضبوط اور سچے ساتھی جناب نواب یوسف علی خان مگسی اسی طرح بے وقت فوت ہو گئے تھے اور اب اس دوست کی وفات پر مجھے بہت تکلیف پہنچی اور خود کو مزید تنہا محسوس کیا۔ مگر خود خدا اور خدائی وہ بڑا علاج ہیں جو دنیا میں انسان کے دل کے ہر درد کی بے خطا دوا کرتے ہیں، جسے ہم 'وقت' کہتے ہیں۔ اس نے کچھ دنوں میں میرے اس درد کا بھی چارہ کر دیا۔ مگر ایک ماہ بعد جب کراچی سے کوئٹہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ سرکار نے اس کو پوچھے بغیر اور اس کی رضا مندی حاصل کیے بغیر 'خان صاحب' کا خطاب دیا تھا۔ اور جیسے ہی ان کو اس مہربانی کی سرکاری طور پر اطلاع دی گئی تو انہوں نے جواب میں کہا تھا، 'آپ کی بڑی مہربانی مگر میں آپ کی یہ عنایت نہیں چاہتا' (عطائے تو بہ لقائے تو بخشیدم)۔ اس پر میں ایک طرف تو بہت خوش ہوا کہ اس میٹھے دوست نے مرتے دم تک انگریز کی عنایات سے خود کو آلودہ نہ کیا' دوسری طرف ان کی بے وقت موت پر ارمان تھا اور دل کا درد مزید بڑھ گیا کہ اس طرح کا قوم دوست، بہادر اور خالص ساتھی جدا ہو گیا''۔

1947ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا اور اس کے فوراً بعد ہی خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے دو ماہ جیل، اور تین ماہ گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ 10 جون 1948ء کو خان نے گلستان میں انجمنِ وطن کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ نظر بندی کے انھی ایام میں عبدالصمد خان نے قائداعظم اور لیاقت علی خان کو خطوط لکھے جن میں اپنی نظر بندی کی وجہ پوچھی۔ یہی خطوط بعد میں 'استقلال' میں بھی چھپے۔ ظاہر ہے ان خطوط کا کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر جیل۔ اور اگست 1949ء میں باقاعدہ ہری پور جیل۔ اب کے بلوچستان کے دو اور اچھے بیٹے اس کے ہم راہ تھے: شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا۔

آزادیٔ وطن کا مطلب ہمارے اکابرین کے ہاں محض انگریز سے آزادی نہ تھی بلکہ وہ داخلی طور پر بھی ہر بشر کو آزاد آباد کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ خان عبدالصمد اچکزئی بالخصوص عورت کی غلامی پہ بہت دکھی تھا۔ اس نے عورت کو 'صنفِ مظلوم' کہا۔ وہ لب (ولور) کی پرزور مخالفت کرتا تھا۔ اسی طرح وہ وراثت میں لڑکی کو بھی حصہ دینے کا حامی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ

ہمارے ہاں ''عورت مملوکہ اشیا کی حیثیت رکھتی ہے''۔ یہ بڑا انسان اس زمانے میں بھی عورت کو اپنی پسند کی شادی کرنے کا حق دیتا تھا۔(16)

1950ء میں 'استقلال' بند کر دیا گیا۔

خان صاحب اس بار مسلسل چھ برس جیل گزارنے کے بعد 1954ء میں رہا ہوا۔ اس نے اپنے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ پائی بلکہ آتے ہی پھر سیاسی کام میں لگ گیا۔ دوسرے سامراج دشمن اور عوام دوست ورکروں اور لیڈروں سے اس کے بہت اچھے تعلقات بنتے گئے۔ مثلاً سوبھو گیان چندانی جب سجاد ظہیر کی پیشیوں پر آتا تو صمد خان سے بھی ملتا۔ ہمارا خان، سوبھو کو بہت چاہتا تھا۔ ڈاکٹر خدائیداد نے مجھے بتایا تھا کہ مارچ 1954ء میں کراچی میں اسمبلی کا پہلا سیشن تھا۔ وہاں باچا خان نے بھی آنا تھا۔ سوبھو بھی وہاں تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور صمد خان بھی چلے گئے۔ خان عبدالصمد خان نے کہا،'' مجھے صرف ایک بات کی سمجھ نہیں آتی۔ ہماری منزل بھی ایک ہے۔ میں Evolution والا ہوں۔ اور تم لوگ Revolution والے ہو جو کہ اس قبائلی نظام میں ناممکن ہے۔ قبائلیت سے جان چھڑانا میرا واحد مقصد ہے۔ میں ایف سی آر (فرنٹیئر کرائمنر ریگولیشن) اور قبائلی نظام کا مخالف ہوں۔ یہی ایک رکاوٹ ہے۔ قبائلیت کی بنیاد پرستی میں عوامی سیاست نہیں ہوتی۔ میرا ایک ہی ہدف ہے، وہی کرتا رہتا ہوں۔ وائسرائے، صدر یا وزیراعظم سب کو لکھتا ہوں، جلسے میں بھی یہی بات کرتا ہوں، لوگوں کے ساتھ میل ملاقات میں بھی یہی دہراتا رہتا ہوں۔ قبائلیت کے خلاف کام کرنا میرا مشن ہے''۔(17) میں ارتقائی طریقے سے کام کرتا ہوں۔ میں نے خانی چھوڑ دی۔ میں خان نہیں ہوں۔ لغڑی ہوں۔ ساتھی چاہتے ہیں کہ میں خانی جاری رکھوں۔ آتے ہیں میرے پاس کہ تم خان ہو، بڑے ہو مگر میں نہیں مانتا۔ میری سیاست بہت مشکل ہے۔ پولٹ بیورو (وہ پیار سے ڈاکٹر خدائیداد کو پولٹ بیورو کہتا تھا) کی مہربانی ہے کہ آتا جاتا ہے''۔ وہ ڈاکٹر خدائیداد کو ہمیشہ کہتا تھا کہ وہ سوبھو کے ساتھ رہے، اس سے سیکھے۔

خان عبدالصمد خان اور اس کے دوسرے رفقا مکمل طور پر سیاسی جان دار تھے۔ اور کچھ بھی نہیں کرنا، اٹھتے بیٹھتے سیاست: ''گو 1954ء میں چھ برس کی مسلسل قید سے رہائی کے وقت میں

سخت بیمار تھا اور پتے اور گردے کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ سرکاری طور پر مقرر کردہ ڈاکٹروں کے بورڈ نے پتے کے بڑے آپریشن کا مشورہ دیا تھا تاہم میرے پرانے رفقائے کار اور نوجوان میرے گرد جمع ہوگئے اور بستر علالت پر مجھ سے بلوچستان کے معاملے پر گفتگو شروع کر دی''۔

کچھ وقت کے بعد ایک جماعت ''ورور پشتون'' کے نام سے تشکیل دی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے اندر پشتونوں کی ایک ایسی خودمختار وحدت قائم کی جائے جو متصلہ پشتون آبادی والے خطوں پر مشتمل ہو اور یہ وحدت عدم تشدد اور آئینی ذرائع کے ذریعے قائم کی جائے۔ خان کو اس تنظیم کا کنونیز مقرر کیا گیا۔

اس پارٹی کا آفس سیکرٹری ہمارا بزرگ اور مستقل مزاج انقلابی جناب انجم قزلباش تھا۔ زمرد حسین جیسے موتی بھی اکٹھا کیے تھے خان نے اس پارٹی میں۔ اس نے اپنے رفقا محمد ہاشم خان، محمد یوسف اچکزئی اور محمد اکبر خان کے ساتھ مختلف علاقوں کے دورے کیے اور جلسے منعقد کیے۔ ابھی اس جماعت نے اپنی جڑیں صحیح طور پر مضبوط بھی نہیں کی تھیں کہ خان کو ایک بار پھر 17 جولائی 1954ء کو غیر معینہ مدت کے لیے اپنے گاؤں عنایت اللہ کاریز میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کی نظر بندی کے بعد ملک محمد عثمان کو قائم مقام کنونیز بنایا گیا۔

پاکستان پھر کبھی سنبھلا نہیں۔ حاکم اُسے گندگی کے دلدل میں ڈبوتے رہے۔ اُن میں سے سب سے بڑا دلدل، ون یونٹ کا قیام تھا۔ اب اس وطن میں مادری قومی زبان اور ثقافت کی بات کرنا کفر ٹھہرا، قومی خوداختیاری کی بات کرنا اسلام دشمنی بن گئی۔ سب کچھ پنجاب کا، کراچی کا۔ محکوم اقوام اور محکوم طبقات غلامی کے گڑھوں میں گہرے دھکیلے جاتے رہے۔ زبان بندی حاکم کا امر تک امر بن گیا۔

روشن فکر اور مترقی سیاسی پارٹیاں سرجوڑ کے بیٹھیں اور نتیجے میں 1956ء کے آخر میں لاہور میں نیشنل پارٹی بن گئی۔ چھ پارٹیاں اس میں ضم ہوگئیں: خدائی خدمت گار، ورور پشتون، استمان گل، سندھ ہاری کمیٹی، سندھ محاذ اور آزاد پاکستان پارٹی۔ اس نیشنل پارٹی میں لفظ ''عوامی'' ڈال کر اسے نیشنل عوامی پارٹی اُس وقت بنایا گیا جب 1957ء میں ڈھاکہ میں

بھاشانی صاحب کی عوامی لیگ بھی اس میں شامل ہوگئی۔اس نئی پارٹی نے اس زور شور اور محنت سے کام کیا کہ حکمرانوں کو یقین ہوگیا کہ یہ الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل کرلے گی۔اس ملک کی تاریخ رہی ہے کہ اس کا حکمران طبقہ موروثی طور پر بہت ڈرپوک رہا ہے۔چنانچہ یہاں بھی خوف زدہ حاکم طبقہ نے فٹافٹ اکتوبر 1958ء کو مارشل لا لگایا۔اور اس پارٹی کے سارے رہنما گرفتار کرلیے۔ خان عبدالصمد اچکزئی کو چودہ سال کی قید ہوئی۔اس بار اس نے مچ،لائل پور،ملتان،ہری پور اور کوٹ لکھپت کے جیلوں کو آباد کیے رکھا۔خان نے تقریباً پورا ایوبی دور جیل میں گزارا۔

جیل میں اس نے آٹھ امتحان پاس کیے اور جس وقت اسے رہائی ملی تو وہ بی اے پاس تھا۔اس نے جیل میں منشی فاضل،فارسی ادب،پشتو ادب ،انگریزی اور اردو علوم کو پڑھنے میں کامیابی حاصل کی۔اسے ہر جماعت پاس کرنے پر چھ ماہ کی معافی ملتی تھی۔

وہ25اپریل1968ءکو رہا ہوا۔ابھی پوری طرح دوستوں عزیزوں سے مل بھی نہ پایا کہ 24فروری1969ءکو اسے پھر پکڑلیا جاتا ہے۔ایوبی مارشل کے دس سالہ جیل کے آخری ایام میں اسے ’’فیوچر آف فریڈم‘‘ یعنی’’ آزادی کا مستقبل‘‘ نامی کتاب پڑھنے کو ملی۔ایک ایسے وقت میں جب وہ خود انسان کی سب سے پہلی ضرورت’’ آزادی‘‘ سے محروم اپنے وطن سے دور جیل میں پڑا تھا۔یہ کتاب کینیڈا کے مشہور ادیب میاں بیوی چارلس اور ڈائی سن کارٹر نے لکھی۔وہی جوڑا جس نے ایک اور مشہورِ عالم کتاب’’ گناہ اور سائنس‘‘ بھی لکھی۔

جب اس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو گویا پہلی بار سوشلسٹ نظامِ زندگی سے متعارف ہوا۔حالاں کہ اس سے پہلے سوشلزم کے بارے میں کئی دوستوں سے بحث مباحثہ ہو چکا تھا لیکن شاید معلومات کے اعتبار سے یہ کتاب بہت جامع تھی۔

وہ اس کتاب سے اور سوشلزم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کرڈالا۔

اس نے اس کتاب کا خوب صورت اردو ترجمہ’’ آزادی کا افق‘‘ کے نام سے کیا تھا(ہم یہ نایاب اور اہم کتاب ماہتاک ’سنگت‘ میں قسط وار شائع کرتے رہے ہیں)۔اس نے اور کئی کتابوں کے ترجمے کیے تھے جن میں گلستان سعدی(پشتو)،امام غزالی کی کیمیائے سعادت(پشتو)‘مولانا

ابوالکلام آزاد کی لکھی ہوئی قرآن مجید کی تفسیر،ترجمان القرآن کے چند سیپارے(پشتو) شامل ہیں۔اس نے پشتو ڈکشنری پر بھی کام کیا۔ایک کتابچہ’’ پشتو لیک دود‘‘ کے نام سے لکھا اور اس کے علاوہ اپنی سوانح لکھی،جو کہیں جا کر 2004ء میں تین جلدوں میں شائع ہوسکی۔یہ بہت ہی خوب صورت کتاب ہے،جس میں خان نے بہت باریکی اور تفصیل سے اپنی زندگی کے بارے میں لکھا۔ اس نے اس میں ہمارے وطن میں موجود برائیوں سے خوب جنگ کی۔اغلام بازی،جن پرستی اور پیر پرستی کے خلاف خوب تفصیل اور بہادری سے لکھا۔

خان' عظیم کہ بہادری سے لکھا، بیٹا محمود خان عظیم کہ ایک لفظ کاٹے بنا اُس بڑے شخص کی باتیں من وعن چھاپ دیں۔کتاب میں رواں اور خالص پشتو استعمال کی گئی۔اس نے سخت محنت سے کوشش کی کہ ہر بات اور اصطلاح پشتو میں ہو۔چنانچہ کئی نئے الفاظ یا ناشناس الفاظ استعمال کیے مگر بریکٹ میں اردو،انگلش یا فارسی اصل اصطلاح بھی دے دی۔وہ بہت سادہ اور صاف پشتو لکھتا تھا۔عربی،فارسی اردو سے بہت دور بھاگتا تھا۔اس نے اپنی نئی اور یکتا املا ایجاد کی تھی جو ملاؤں کے املا سے بالکل مختلف ہے۔اپنی اس تصنیف میں خان نے باریک ترین تفصیلات دی ہیں۔اپنے خاندان،گاؤں،سماجی اچھائیوں،برائیوں کے بارے میں عرق ریز محنت کی ہے۔اس نے نہ صرف عمیق تحقیق ہے بلکہ یہ کتاب اخلاقی جرأت کی معراج بھی ہے۔غیرت کے مارے آج کے نوجوانوں کو حیرت ہوگی کہ خان نے یہ تصنیف اپنی زوجہ(بیوی) کے نام منسوب کردی تھی۔

صمد خان کے سارے دوست بھائی اور عزیز اُس کے ساتھی ہی تھے۔اور وہ ساتھی سب کے سب بلوچ تھے۔جیلوں میں عرصے تک رہنا،دیگر دنیاوی معاملات ساتھ چلانے اور سیاست ساتھ ساتھ کرنی۔چنانچہ فطری طور پر دوستوں میں کچھ خامیاں بھی نوٹ کرلیں،وہ خان نے چھپائیں نہیں بلکہ نہایت ہٹ دھرمی سے من وعن بیان بھی کردیں۔خود اپنی کوتاہیاں،کمزوریاں بھی نہیں چھپائیں۔(قاری تو اُن سب کی رفاقت اور عظیم سماجی کام کو دیکھے گا،قریب ترین دوستوں کے باہمی تلخ وشیریں واقعات اُن اکابرین کا آپسی معاملہ تھا)۔

ملک ٹوٹا تو ون یونٹ بھی ٹوٹا،نیپ بھی ٹوٹ گئی۔خان نے نیشنل عوامی پارٹی کو خیر باد کہا

اور جولائی 1970ء میں اپنی الگ پارٹی، پشتونخواہ نیشنل عوامی پارٹی بنالی۔ خان اس پارٹی کا کنوینر ہوا۔ وہ صوبائی اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا۔

بلوچستان میں اس عوام دوست شخص نے صرف عورتوں کی نجات کے خواب نہ دیکھے تھے بلکہ وہ سرداری نظام کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھا۔ (مگر وہ ایسا اپنا بن کر کرتا تھا۔ بلوچوں کے شانہ بشانہ جیل والی جدوجہدیں کرتا ہوا وہ بالائی طبقات کی مخالفت میں باقاعدہ جلسہ جلوس کرتا تھا۔ بلوچ جدوجہد سے باہر بیٹھ کر، یا پھر بلوچ دشمنی میں ایسا نہیں کرتا تھا)۔ وہ سرداروں کو انگریزوں کا ساتھی قرار دیتا تھا اور عوام کی لوٹ مار میں مقامی سردار اور غیر ملکی فرنگی کو حصہ دار گردانتا تھا۔ ''ہماری اصل جنگ تو ہماری آزادی کے غاصب انگریزی حکومت سے تھی مگر انسانی آزادی کے شکاری انگریزی سرکار نے اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے اپنے گرد بہت سے حصار، مورچے اور دمدمے بنا رکھے تھے۔ کہیں ریاستیں، کہیں سرداریاں، کہیں جرگے، کہیں لیویز فورس اور کہیں ان گنت چھوٹی چھوٹی اور خسیس مراعات اور نوکریاں، وغیرہ......''۔ جن اکابرین کے ساتھ اس نے کام شروع کیا اور وہ سب کے سب سرداری نظام سے نالاں تھے۔ ان کی ''جدوجہد شروع ہی انگریزی سامراج کے اس پہلے مورچے سے ہوئی جسے 'سرداری نظام' کہتے ہیں اور اس راہ کے کانٹے ہمارے قدموں اور تلووں میں چبھ چبھ کر انہیں لہولہان کرتے ہوئے ٹوٹتے رہے......''(18)

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں تو اس نے سرداروں پر انتخابات میں حصہ لینے تک پر پابندی لگانے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس کا مؤقف تھا کہ سرداروں کو سرکار کی طرف سے باقاعدہ وظیفہ ملتا ہے اور یہ لوگ تنخواہ لیتے ہیں اور سرکاری ملازم الیکشن کیسے لڑ سکتا ہے۔ وہ سرداری اور سیاست کو الگ رکھنا چاہتا تھا۔

زندگی کے انھی آخری برسوں میں اس کے مخالفین اور حامیوں دونوں نے اسے متنازع بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ کوئی اسے جارحانہ قوم پرست کہتا اور کوئی شاؤنسٹ۔ جب کہ خود اس کا کہنا تھا کہ ''میں سرے سے نہ قوم پرست ہوں اور نہ رہا ہوں۔ نہ جارحانہ قسم کا اور نہ غیر جارحانہ طرز کا۔ میں تو انسان دوستی تک پہنچنے کی کوشش میں ہوں جس کا راستہ قوم پرستی سے نہیں، قوم پروری

کی منزل سے ہو کر گزرتا ہے''۔ اس کی خواہش تھی کہ تعلیم مفت اور لازمی ہو۔ وہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتا دیکھنا چاہتا تھا۔(19)

وہ مادری زبان میں علم کے حصول کے حق میں تھا۔ صرف قوموں اور قومیتوں کے لیے نہیں بلکہ ''شعوب اور قبائل تک کے لیے'' مادری زبان میں تعلیم کا انتظام ضروری خیال کرتا تھا۔ وہ پشتون قوم کی شناخت، ان کے وسائل پر انھی کے اختیار اور ان کے اتحاد و اقتدار کے لیے کوشاں رہا۔ یہ ایسے معاملات ہیں جن پہ کبھی کبھی زبان تلخ اور رویہ درشت ہو ہی جاتا ہے۔ کچھ اسی تلخی اور درشتی نے، کچھ اس کے نئے لسانی نزدیک بین ساتھیوں نے، اور کچھ اس کے مخالف سرداروں اور ان کے ساتھی دانش وروں نے بلوچستان بھر کے اس محترم اور معزز بلند قامت انسان کو محض پشتون ''قوم پرست'' اور وہ بھی ''جارحانہ'' قوم پرست کے متنازع الفاظ کے ساتھ جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ صمد خان کا بڑا مقام ہی یہ ہے کہ وہ پشتون کے ساتھ ساتھ برصغیر بالعموم اور بلوچستان بالخصوص کی آزادی کا راہبر اور راہنما تھا۔ اس کا مقام ہی یہی ہے۔ اس شخص نے بلوچستان کی بے آئین سرزمین سے انگریزی استبداد کے خلاف اُس وقت صدائے حق بلند کی، جب یہ خطہ ہر نوعیت کے جمہوری حقوق و اصلاحات کے نام تک سے ناآشنا تھا۔ اور بقول امین کھوسہ عبدالصمد خان بلوچستان میں نہ ہوتا تو پھر، کوئی مخالفت کرے یا موافقت، اسی قوم بلوچستانی کو گورنری قطعاً نہیں مل سکتی تھی......''(20)۔ وہ ایک اور جگہ لکھتا ہے: ''میں کہہ سکتا ہوں کہ عبدالصمد کو بلوچستان سے پیار ہے۔ وہ بلوچستان پر عاشق ہے۔ مجھے عبدالصمد کی ایمان داری پر یقینِ کامل ہے''۔(21) خان عبدالصمد خان خود ایک مضمون میں بلوچستان سے اپنی محبت کا یوں اظہار کرتا ہے: ''بلوچستان...... کتنا سہانا ہے یہ نام۔ خصوصاً میرے لیے، کیوں کہ میری زندگی کا نہ صرف ایک طویل عرصہ بلکہ جوانی کا بہترین زمانہ اسی نام کے خطۂ زمین کی خدمت کرتے اور اس کی بہتری کی جدوجہد میں صرف ہوا ہے''۔

مگر دوسری طرف اِس بڑے انسان سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ اپنی قوم پروری کی جدوجہد میں وہ اس کے انتہا پسند کونے سے خبردار نہ رہا۔ دو دھاری تلوار ہے، قوم پرستی۔ اچھا استعمال کرو تو کارآمد چیز ہوگی، برا استعمال کرو تو سماج کے لیے زہرِ قاتل۔ اور خان عبدالصمد خان اپنی زندگی کے

آخری دو چار برسوں میں اپنے اچھے دماغ میں لگے اُس آلے کی طرف متوجہ نہ ہوا جو بار بار اسے تیز رفتاری کی آخری حدود میں داخل ہونے کی اطلاعات دیتا رہا ہوگا۔

یہ عبدالصمد اچکزئی ہی تو تھا جس نے دسمبر 1969ء کے ماہنامہ ''بلوچی دنیا'' میں یہ خوبصورت فقرے لکھے تھے...... ''جہاں تک میری ذات اور اپنے محترم رفقا شہزادہ عبدالکریم خان اور میر غوث بخش بزنجو، کا تعلق ہے، (تو) ہم اُس وقت ایک تھے، اب ایک ہیں اور ایک ہی رہیں گے۔ میری قربانیاں اُن کے لیے اور اُن کی ہیں، اور اُن کی میری۔ نہ اُن کو پشتونوں پر حکومت کرنے اور انہیں اپنی قومیت اور زبان سے محروم کرنے کا خبط ہوسکتا ہے اور نہ مجھے''۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ خود کو اس زور شور سے پشتون کہنے اور کہلوانے لگا کہ اس کے یارِ غار امین کھوسہ تک کو یہ کہنا پڑا کہ ''وہ اپنے کو پشتون کہتا ہے تو بڑا پشتون میں ہوں اور اِس طرح سب بلوچ 'پشتون' ہیں۔'' (22)

کتنے اچھے لوگوں کا گروہ تھا یہ!۔ کھرے اور صاف ستھرے لوگ!! وہ 17 سال انگریز کی جیلوں میں پڑا رہا، آزادی کے لیے۔ وہ 16 سال پاکستانی جیلوں میں سڑتا رہا، جمہوریت کے لیے۔ اس بڑے اچکزئی صاحب نے اپنے رفقا کے لیے یوں کہا تھا: ''میں اپنی مرضی سے یہ اختیار دیتا ہوں کہ وہ میرے تمام افعال حتیٰ کہ خانگی زندگی، رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات، مال کے صرف کرنے، طریقِ زندگی وغیرہ کے متعلق مجھ سے باز پرس کریں۔ میں اپنی مرضی سے اپنے مال کو صرف کرنے کا حق بھی محفوظ نہیں رکھتا بلکہ میرے مال کا جو حصہ کسی غیر مفید کام میں صرف ہوتا ہو تو اس پر آپ میں سے ہر ایک بھائی کو مکمل اختیار ہے کہ مجھ سے چھین کر جیسا چاہو صرف کرو''۔ (23)

خان کو اور خان جیسے بے شمار نیک لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہوسکتا کہ اُن کے دنیا سے گزر جانے کے بعد ان کی تعلیمات کا مغز نکال کر پھینک دیا جائے گا اور محض نظریات کا جامہ رہنے دیا جائے گا، جسے کوئی بھی بھیڑیا اوڑھ کر بھیڑوں کے گلے کے ساتھ اپنی خواہش کے مطابق حشر کر سکتا ہے۔ تمام بڑے انسانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے...... ایسا نہیں ہونے دینا چاہیے۔

عبدالصمد خان عدم تشدد کا علم بردار تھا۔ جس خطے میں زبانِ تکلم ہی چاقو اور خنجر تھا، وہاں وہ عدم تشدد کی بات کرتا تھا۔ وہ اگر نفرت کرتا تھا تو صرف نفرت سے نفرت کرتا تھا۔ وہ دلائل کی بات

کرتا تھا۔ وہ آخر تک سچائی کا دامن تھامے رہا۔ اس کا مقصد مظلوم انسانیت کو مظالم سے نجات دلا کر ایک ایسا امن قائم کرنا تھا جس میں مظلوم عوام کے ساتھ کسی قسم کے استحصال کا تصور تک نہ ہو۔ اس کی شخصیت میں بے پناہ شائستگی تھی۔ بڑے معصوم قہقہے تھے اس کے۔

یوسف عزیز مگسی، عبدالعزیز کرد، عبدالرحمٰن بگٹی، محمد حسین عنقا اور امین کھوسہ کے عزیز بھائی اور بلوچستان کا یہ محبِ وطن بیٹا دو دسمبر 1973ء کو رات کو اس وقت بم کا نشانہ بنا، جب وہ کوئٹہ شہر میں اپنے بستر پر محوِ خواب تھا۔ 66 سالہ امن کے سپاہی کو بم سے مار دیا گیا۔ عبدالکریم امن نے لکھا: ''آج ہم سے اس بزرگ ہستی کو چھین لیا گیا ہے جس نے ہمیشہ انسانیت کی بھلائی کے لیے عدم تشدد کا پرچار کیا اور خود ہلاکت خیز تشدد کا، جیل کا، صعوبتوں کا شکار ہوا۔ حتیٰ کہ اِس کی راہ میں اپنی 65 سالہ عزیز زندگی کے 28 سال جیل کی تنگ و تاریک خارزار میں نہایت حوصلہ اور بہادری سے گزارے۔ خان موصوف نے بلوچستان کے نمائندے کی حیثیت سے آزادیِ ہند کی جدوجہد میں انگریزی حکومت کی غلامی کے خلاف اہم کردار ادا کیا...... مرحوم کے دوست وہ ہیں جو عوام کو محبت، اخوت، خیر سگالی اور اتحاد کا سبق دیتے ہیں''۔ بلوچی گاندھی کے نام سے مشہور عدم تشدد کا یہ علم بردار سخت ترین تشدد والی موت کا شکار ہوا حالاں کہ اس کا نظریہ تو یہ تھا کہ ''میرا ہمیشہ یہ اعلان رہا ہے کہ میں دنیا بھر میں کسی سے انتقام، کینہ اور دشمنی وغیرہ نہیں رکھتا''۔ (24)

بقول عبداللہ جان جمالدینی ''............ جس نے اپنی زندگی قبل از وقت اُس سرزمین کے لیے، جس پر میں رہ رہا ہوں اور عوام پر' قربان کردی............'' (25)

ہم مزید کچھ نہیں لکھتے۔ اتنے بڑے آدمی کی موت کے لیے اپنے اکابرین کے ردِ عمل کو نقل کر کے ہی صمد خان اچکزئی کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں:

جناب اختر بلوچ نے کہیں لکھا کہ ''اس واقعہ پر میں نے اپنی آنکھوں سے محمد امین کھوسہ کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا۔ وہ سردار امین کھوسہ' کہ جس کے مضبوط اعصاب کی لوگ مثال دیا کرتے تھے''۔

حوالہ جات

1۔ اچکزے، اودل سمد خان ۔ زما ژوند اوژوندون ۔ جلد اول ۔ 2004 پشتونخواہ ادبی سانگہ ۔ صفحہ 67

2۔ کاکڑ، گل محمد ۔ روزنامہ جنگ ۔ دو دسمبر 1994

3۔ مصنف نامعلوم ۔ ''چپلوا کی تڑون'' کابل، صفحہ نمبر 160

4۔ علیزئی، نصراللہ ۔ روزنامہ مشرق ۔ 2 دسمبر 1991 ۔

5۔ اچکزئی ۔ عبدالصمد ۔ زما ژوند اوژوندون ۔ جلد نمبر 2 ۔ 2004، کوئٹہ ۔ صفحہ 18

6۔ اچکزئی......جلد دوئم ۔ صفحہ 373

7۔ اچکزئی......جلد دوئم ۔ صفحہ 375

8۔ اچکزئی ۔ زما ژوند......جلد نمبر 3 صفحہ 193

9۔ روشن، عیسیٰ ۔ روزنامہ جنگ کوئٹہ ۔ دو دسمبر 1999 ۔

10۔ اچکزئی ۔ زما ژوند......جلد نمبر 3 ۔ صفحہ 193

11۔ اچکزئی ۔ زما ژوند......جلد نمبر 3 ۔ صفحہ نمبر 134

12۔ بلوچ، اسلم ۔ از قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی تا نیشنل پارٹی ۔ سہ ماہی جہد ۔ شمارہ نمبر 1 ۔ 2004 صفحہ 33

13۔ کوثر، انعام الحق ''بلوچستان میں اردو'' صفحہ 367

14۔ غنو، عبدالغنی ، بابائے پشتون اور پشتونخوا ۔ 2000 ۔ جلد ہفتم ۔ نادر ٹریڈرز ۔ مستنگ ۔ صفحہ نمبر 273

15۔ بلوچ ۔ اختر علی خان ۔ بلوچستان کی نامور شخصیات ۔ جلد اول ۔ 1994 ۔ رائل بک کمپنی کراچی صفحہ 73

16۔ اچکزئی، عبدالصمد ''بے بسی کی انتہا'' ماہنامہ الحنیف جیکب آباد ۔ مارچ 1938 صفحہ نمبر 53

17۔ خدائیداد ڈاکٹر، خان شہید عبدالصمد خان بطور ادیب، روزنامہ جنگ ۔ 2 دسمبر 1992

18۔ اچکزئی، عبدالصمد ''معروضات'' ۔ نوائے وطن کوئٹہ 25 دسمبر 1971

19۔ اچکزئی ۔ خان عبدالصمد خان ۔ ''بے بسی کی انتہاء'' ۔ سالنامہ الحنیف جیکب آباد ۔ مارچ 1938 ۔ صفحہ 53 ۔

20۔ ملک، محمد پناہ ۔ نوائے وطن ۔ کوئٹہ 9 ستمبر 1978 ۔ صفحہ 2

21۔ امین کھوسہ کا خط، ملک فیض یوسف زئی کی کتاب ''یادداشتیں'' صفحہ نمبر 195

22۔ ایضاً

23۔ عبدالصمد، خط بنام ملک فیض یوسف زئی '' یادداشتیں'' صفحہ نمبر 139

24۔ ایضاً، صفحہ 136

25۔ جمالدینی، عبداللہ جان ۔ لٹ خانہ ۔ کوئٹہ ۔ صفحہ 191

ماتھے کا بوسہ

میر محمد حسین عنقا

(1977-1907)

چہ دُرسیں گلزمیں جواں منی بلوچی ایں وطن
ہمے زمین منی ، ہمشی بڑزیں آسمان منی
ہمے زمین و آسمانئے ہر چی درمیان ، منی
ہمیشی جھیڑہ و صلاح ہمیشی سیٹ و زیان منی

عنقا

محمد حسین عنقا بلوچستان میں سیاسی (شہری) جدوجہد کے بانیوں میں سے تھا۔ اس نے نہ صرف انگریزوں کی مخالفت کی، آزادیِ وطن کے لیے برسرِ پیکار رہا بلکہ وہ آزادی کے بعد پاکستانی حکمرانوں کی ہوسِ ملک گیری کے خلاف بھی جدوجہد کرتا رہا۔

بلوچ قومی وعوامی تحریک کے اکابرین میں سے دو اشخاص غریب ترین طبقے میں سے تھے: محمد حسین عنقا اور ملک محمد پناہ۔ عنقا، بلوچ لیڈروں کی اس طویل فہرست میں بھی شامل ہیں جنھیں کینسر کے مرض سے لڑنا پڑا تھا۔ عنقا صاحب، اور دوسرے معاصر بلوچ لیڈروں میں یہ بات بھی

مشترک ہے کہ انہوں نے اُس استبدادی دور میں سیاست شروع کی جب یہ ممنوعہ شجر ہوا کرتی تھی۔ اُس میوے کو کھانا تو درکنار اس کی طرف دیکھنے سے بھی خُلد بدری یقینی ہوجاتی تھی۔

عنقا صاحب کی ایک اہمیت یہ ہے کہ وہ اور اس کا بھائی نصف صدی تک بلوچستان کی سیاسی سماجی اور ادبی تحریک کے ہر لمحہ میں موجود اور شامل رہا...... بلوچ قومی تحریک کیا ہے، سوائے جیلوں کال کوٹھڑیوں کے، سوائے قلی کیمپوں کے، جرمانوں کے، اور سوائے نظر بندیوں، جلاوطنیوں کے!!۔ پتہ نہیں بلوچ کا کوئی گنیز بُک ہے بھی یا نہیں؟! اور اگر ہے تو اس میں سیاہ کاریوں اور قتل قتال کے علاوہ بھی کسی نے کچھ درج کیا ہے یا نہیں؟! پتہ نہیں ہم کب اس قابل ہوں گے کہ وادی وادی بکھرے سنہرے صفحوں کو یک جا کر پائیں گے اور سینہ تان کر اپنی تابناک لاگ بک دنیا کو دکھانے کے قابل ہوں گے؟۔ کاش اپنی اولاد ہی جان جائے کہ ہم بھیڑوں پہ مشتمل گُنگ اور بے حس قبرستان نہیں بلکہ حسین ترین عالمی انسانوں کی صف میں موجود قوم ہیں۔ جھداں، رقصاں، ماتم کناں، شکستہ وایستادہ، فتح مندو تیز رو۔

جولوگ نظریات کی پاکی، جدوجہد میں استقلال اور زندگی بھر ستھرا رہنے والی سیاست کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور صرف جیلوں کی طوالت اور اذیت سے بڑے پن کو جانچنے کے عادی ہیں، اُن کو میں بتاتا ہوں کہ وہ اپنے تمام حواس قابو میں رکھ کر میرا یہ اگلا فقرہ پڑھ لیں: عنقا نے وطن کی آزادی آبادی کی خاطر بیس سال، چار ماہ اور گیارہ دن غیر انسانی جیلوں میں گزار دیے۔ ان میں ہمارے اس بزرگ کی جلا وطنی والے دس برس شامل نہیں ہیں......... اور بھی سننا چاہیں گے؟ اچھا سنیے: صرف انگریز سرکار نے اُس کے سترہ اخبار ضبط کیے، جی ہاں ایک، دو، تین...... سترہ اخبار۔ سب سے پہلا اخبار ''البلوچ'' عنقا ہی نے نکالا...... بلوچ کا پہلا سیاسی جلسہ بھی اسی نے کیا۔ عنقا ہی سندھ بلوچستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں سے تھا۔ درخانی مکتبہ کے بعد عربی اردو رسم الخط میں بلوچی لکھنے والا پہلا شخص بھی وہی تھا اور 1929ء میں بلوچی میں پہلی نظم اسی نے ہی لکھی۔ (1)۔ شاعری میں بھی امتیاز کہ ایک نظم پہ اسے ساٹھ ہزار روپے جرمانہ اور دو سال کی قید ہوئی تھی۔ (اب بتائیے کہ بلوچ عوامی تحریک میں کسی احساسِ کم تری کی کوئی گنجائش ہے؟!)۔

اِس سب کے باوجود عنقا اپنے ایمان پہ مستحکم رہا۔ ہمہ وقت عوامی فلاح کا کام کرتا رہا۔آسٹروفسکی نے صحیح تو لکھا تھا کہ جب زندگی آپ کو بہت عذاب دے تو آپ ہر وقت ایک گولی اپنے سر کے پار اتار سکتے ہیں۔مگر کیا آپ نے زندگی میں سے بہتر نچوڑنے کی کوشش کی؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ نے وہ سب کچھ کر کے دیکھ لیا جو آپ اس فولادی جال کو توڑنے کے لیے کر سکتے تھے؟۔اُس وقت زندہ رہنا سیکھئے جب زندہ رہنا ناقابلِ برداشت ہو‘‘۔

............اور ہمارے پیش روؤں نے ایسا ہی تو کیا تھا۔

میر عبدالعزیز کرد کی طرح محمد حسین عنقا بھی 1907ء، 20 ستمبر کو، مچ میں میں پیدا ہوا۔اس کا والد ٹھیکیدار تھا، محمد عبداللہ۔ بنیادی طور پر یہ پنجگوری خاندان تھا جو 1883ء مزدوری اور روزگار کی تلاش میں کراچی منتقل ہو گیا۔ پھر یہ لوگ ریلوے لائن بچھانے آسام پہنچے۔پھر جب سیوی تا ہرنائی اور بعد میں بولان میں ریلوے بچھانے کا کام شروع ہوا تو یہ ماہرین یہاں آئے اور اس کام میں لگ گئے۔ مچھ آئے اور یہاں آسام میں کان کنی کے تجربے کو کام میں لاتے ہوئے کوئلے کی کان کنی میں لگ گئے۔

عنقا صاحب کی بنیادی پرائمری تعلیم مچ میں ہوئی۔ مڈل سکول سبی سے آٹھ پڑھے اور 1924ء میں میٹرک کر لیا۔وہ میٹرک میں سارے بلوچستان میں اول آیا۔اسی طرح منشی فاضل کا امتحان بھی اول درجے میں پاس کیا(2)۔محمد حسین عنقا نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے انگلش اور ایم اے فارسی کیا۔ وہ سکول ٹیچر بنا اور وہ بھی مری قبیلے کے ہیڈ کوارٹر کاہان میں۔ جہاں وہ دو سال تک رہا۔(اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری سیاسی تحریک کے بانی اَن پڑھ، کوڑھ مغز اور جاہل نہ تھے بلکہ ٹوپرز Toppers تھے، بلوچستان بھر میں اول آنے والے)۔

1926ء میں اس نے محمد حسن نظامی اور محمد نسیم تلوی کی طرح نوکری چھوڑ دی اور عبدالعزیز کرد کا ساتھی بنا............قرآن شریف پر حلفاً دستخط کر کے ’’انجمن اتحادِ بلوچاں‘‘ میں شامل ہوا۔انجمن انڈر گراؤنڈ تھی۔

24 دسمبر 1932ء کو جیکب آباد میں آل انڈیا بلوچ کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا، جس

میں پنجاب سندھ اور بلوچستان کی سرکردہ شخصیتوں نے شرکت کی۔کانفرنس کی صدارت ہز ہائی نس میر علی نواز خان تالپور نے کی۔ باقی عہدے سندھ اور بلوچستان کے زعما میں تقسیم ہوئے۔سیکرٹری سردار محمد اعظم خان مزاری اور جوائنٹ سیکرٹری محمد حسین عنقا منتخب ہوا۔اسی کو ہی تو منتخب ہونا تھا۔اس لیے کہ بہت واضح سوچ تھی اس کی۔عنقا صاحب کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

خوردن و خفتن نشائد باتو اے قومِ بلوچ
خیز دریاب از عمل رازِ نصابِ زندگی
گیر درسِ زندگی از کشکول نوری نصیر
خدمتِ خلقِ خدا لبِّ لبابِ زندگی

جیکب آباد کانفرنس میں ہی یہ طے ہوا کہ تحریک کی کامیابی کے لیے اخبار کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ محمد حسین عنقا کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا۔عنقا نے صدائے عصر پہ لبیک کہا، سکول ٹیچری کی اپنی پکّی ملازمت چھوڑ دی اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے لاہور، دِلی اور کراچی کا دورہ کیا۔ بالآخر طے پایا کہ اخبار کراچی سے نکالا جائے۔ دوستوں نے میر عبدالعزیز کرد اور میر محمد حسین عنقا کو کراچی بھیجا اور ان کے لیے اور اخبار کے لیے دو سو روپے ماہوار مقرر کیے۔ چندہ اس طرح رکھا گیا: یوسف علی خان، میر عبدالرحمٰن بگٹی، سردار رسول بخش مینگل اور خان عبدالصمد خان پچاس پچاس روپے ماہوار دیں گے‘ خواہ اپنی جیب سے دیں یا دوسروں سے چندہ کر کے‘‘(3)

بعد میں میر عبدالعزیز کرد واپس آیا اور عنقا صاحب اخبار ’’البلوچ‘‘ چلاتا رہا۔اس پارٹی اخبار کو وہاں کے دوست یعنی مولوی عبدالصمد سر بازی، مولوی محمد عثمان اور میر شہداد زئی مشترکہ طور پر چلاتے تھے۔عنقا صاحب کے جانے سے گویا یہ بلوچستان کا اخبار بن گیا۔ بلوچستان میں لوگ اسے بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور خریدتے تھے۔اس کے علاوہ بلوچستان سے لکھاری اس میں لکھتے تھے۔(4)

یہ سلسلہ ایک سال تک چلتا رہا۔ پھر یہ اخبار بند ہو گیا۔عنقا صاحب کے بھائی سکول ٹیچر محمد حسن نظامی کو نوکری سے نکال دیا گیا، جو اُس وقت پشین میں متعین تھا۔اُس پر بھی انگریز کا دل ٹھنڈا نہ ہوا تو دوسرے بھائی محمد عثمان کی کوئلے کی کان ضبط ہو گئی۔

نہیں ہے جب وطن کے دوسرے فرزند کو آرام
بھلا کیسے یہ ممکن ہے کہ عنقا کو قرار آئے

(عنقا۔1936)۔(5)

انگریز کے خلاف آزادیِ وطن کی جدوجہد تو بہت کٹھن تھی، بہت خوف ناک، کانٹوں بھرا راستہ، کبھی ختم نہ ہونے والا راستہ۔ مگر عنقا خوف زدہ نہیں ہوا:

اب بحر میں کشتی ڈال چکے طوفانِ بلا کا شور سہی
ساحل کا نشاں مفقود سہی تاریک گھٹا گھنگھور سہی
انجام میں ہر اک ظالم نے مظلوم سے نیچا دیکھا ہے
کم زور تو بدلہ لیتے ہیں وہ مار سہی ہم مور سہی
شمشیر بلوچی ٹوٹ گئی تو اس سے عدو دل شاد نہ ہو
وہ ہوش نہ ہو، وہ جوش تو ہے، دو ہاتھ تو ہیں کم زور سہی۔(6)

پہلی کانفرنس کے بعد دوسری آل انڈیا بلوچ کانفرنس کے حیدرآباد میں منعقد کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ سرکار طیش میں آئی اور مگسی صاحب کو جبراً لندن بھجوا کر عبدالصمد اچکزئی اور عبدالعزیز کرد کو جیل میں بند کر دیا۔ لہٰذا، اب بلوچ کاز کا ترجمان محمد حسین عنقا بن گیا اور کراچی میں لگا جلسے کرنے۔ انگریز نے جب ''البلوچ'' بند کر دیا تو عنقا نے ''بلوچستان جدید'' نکالا۔ انگریز نے اُسے بند کر دیا گیا، تو عنقا نے ینگ بلوچستان نکالا، وہ ضبط ہوا، تو حقیقتِ آفتاب نکالا۔ وہ بند ہوا، تو کلمۃ الحق نکالا' وہ بند ہوا تو نجات نکالا..........(نجات کی تلاش اُس کی قوم آج تک کر رہی ہے)۔ المختصر، 1933ء سے لے کر 1937ء تک کے محض 4 سالوں میں اس کے 9 اخبار بند کر دیے گئے۔(7)

''بلوچستان جدید'' میں محترم یوسف علی مگسی کا اولین اور شاید واحد افسانہ ''تکمیل انسانیت'' چھپا تھا۔ اور اسی ''بلوچستانِ جدید'' نے صمد و کرد کی گرفتاری سے دنیا کو آگاہ کیا۔

بلوچ اور بلوچستان کے بارے میں عنقا صاحب نے تو وزیر خارجہ کا کردار ادا کیا۔ لاہور

اور دہلی کے سفر کے دوران محمد حسین عنقا، میر عبدالعزیز خان کرد کے ساتھ علامہ اقبال سے ملا۔ اسے بلوچستان کے بارے میں بتایا۔ عنقا نے اس تاریخی ملاقات کو یوں بیان کیا:

بہ سالِ سی و سہ لاہور رفتیم
کہ سردکتور شیخ اقبال بہ بینیم
بہ ایواں خانہ پیشِ او نشستیم
گزارش بازبانِ تلخ کردیم
چہ ترکستان چہ ترکی و چہ ایران
مراکش اندلس و اسپین و افغان
زیاد کردی نیک گفتی
چرا ذکرِ بلوچی را نہفتی

آل انڈیا کانگریس کے 1935ء کے سالانہ اجلاس بمبئی میں قراردادِ بلوچستان کے لیے جب لیت ولعل کیا گیا تو عنقا نے وہیں بھوک ہڑتال کر دی۔ مہاتما گاندھی کی اپیل پر عنقا نے بھوک ہڑتال ختم کر دی' مگر اپنی قرارداد شامل کرا کے۔

اسی طرح دہلی میں عنقا وہاں کے لیڈروں اور اخباری زعما سے ملا اور ''بلوچستان بہ ہندوستان'' کے عنوان سے یہ نظم اخبارات کو دی:

اے ہند شنیدم کہ بہ ہر درد دوائی
گویند عزیزاں کہ بہ ہر رنج شفائی
وقتے بہ اطالیہ گہے بر فلسطیں
گہ بر کمکِ ترک پُر از شور صدائی
گاہے تو بہ افغان گہے بر مدد چین
وقتے تو بہ کشمیر بہ میداں بدر آئی
ہمسایہِ بے مایہ تریںِ تو من ہستم
جاں بر لبم اے دوست ز بے برگ ونوائی

امّا نظرِ مرحم تست بہ اغیار
الطافِ تو باشد ہمگی دود ریائی
شاید کہ دلت برمنِ بے چارہ نہ سوزد
در نسبتِ ما سنگ دل و سخت چرائی

جنوری 1938ء میں جب بلوچوں کی آواز' عبدالصمد خان اچکزئی نے ''استقلال'' نامی ہفت روزہ نکالا تو محمد حسین عنقا اُس کا دوست، اُس کا بازو تھا۔ اسی طرح 20 مئی 1938ء میں انجمن وطن قائم ہوئی تو عنقا صاحب اس کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا۔ بڑے صمد خان کا بڑا ساتھی بڑا عنقا ہی ہو سکتا تھا۔ بلوچ بدقسمت ہوگا اگر صمد خان پہ فخر نہیں کرے گا، اگر عنقا پر فخر نہیں کرے گا۔

1937ء میں قادر بخش نظامانڑیں، میر محمد امین کھوسہ اور میر محمد حسین عنقا نے سندھ بلوچستان کمیونسٹ پارٹی بنائی۔ اور خوب سرگرمی سے کام کیا۔ کمیونسٹ پارٹی میں اُن کی سرگرمیاں بھی بہت عجیب تھیں۔ بہت خطرناک کام کیا کرتے تھے یہ لوگ۔ وہ زیر زمین رہ کر کام کرتے تھے۔ خفیہ پارٹی میٹنگیں باقاعدگی سے کرنی، نئے ممبر بنانے ....عنقا صاحب تو غیر قانونی سائیکلو سٹائل کا بھی انچارج تھا۔ (سائیکلو سٹائل مشین رکھنا اُس زمانے میں ایٹم بم سے کم خطرناک نہ تھا)۔ وہ رات کو خود ہی سائیکلو سٹائل پر غیر قانونی پمفلٹ چھاپتا اور پھر دوسرے کامریڈوں کے ساتھ سائیکلوں پر بیٹھ کر مختلف علاقوں میں بانٹ آتا تھا۔(8)

پھر جب دوسری عالمی جنگ چھڑی تو غلام ملک کے باشندوں کی حیثیت سے ان لوگوں نے اپنے سامراجی آقا کی جنگ میں ساتھ نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ البتہ جب ان لوگوں کے آئیڈیل ملک' سوویت یونین پر بھی ہٹلر نے حملہ کر دیا تو ان لوگوں نے ہٹلر جیسے مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں' خود اپنی آزادی کی جدوجہد ملتوی کر دی۔ اور اپنے سامراجی آقا برطانیہ کی حمایت کرنا شروع کی۔ اس جنگ کی حمایت میں سرگرمی سے کام کے دوران یہ لوگ حکومت کے خلاف غیر قانونی پمفلٹ بھی چھاپتے تھے۔

جب 17 اپریل 1948ء کو خان قلات کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر دستخط کرنے

پڑے تو آغا عبدالکریم، محمد حسین عنقا اور ان کے 200 کے قریب رفقا ہمارے عام قبائلی روایات کے مطابق احتجاجاً ملک چھوڑ کر افغانستان چلے گئے۔ جب یہ تحریک ناکام ہوئی اور وہ سب دوست گرفتار ہوئے تو عنقا صاحب کے بارے میں جرگہ نے یہ الفاظ کہے: ......''یہ ایک سیاسی مشکوک شخص ہے اور اِس پارٹی کے اندر شہزادہ کا سب سے زیادہ منظور نظر تھا۔ اکثر تحریرات جو پاکستان حکومت کے خلاف جاری کی گئی ہیں، اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ شخص شروع سے قلات کو وسیع بنانے میں کوشاں چلا آرہا ہے۔ بلوچی حکومت کے ماسوائے ہر حکومت کی مخالف میں چلا آرہا ہے......''(9)
ایسی سند خدا کرے ہر شخص کو نصیب ہو!!۔

دس سال کی جیل شہزادہ اور عنقا کو ہوئی' ہری پور میں۔ اُن کے ساتھ محمد سعید خان، مولانا محمد افضل اور میر عبدالواحد کرد کو سات سات برس قید اور جرمانہ' اور میر محمد خان رئیسانڑیں کو 3 برس قید کی سزا ہوئی۔ میر محمد حسین عنقا اور شہزادہ کو 1949ء میں ایک اور بڑے سیاسی قیدی خان عبدالصمد خان اچکزئی کے ہم راہ مچھ سے سنٹرل جیل ہری پور منتقل کر دیا گیا۔ اور وہ 18 جون 1956ء کو رہا ہوئے۔ قلات کا وزیر دربار آغا نصیر خان ان کی رہائی کے موقع پر خان کی کچھ ہدایات لے کر میر عبدالواحد کرد اور قادر بخش نظامانڑیں کے ساتھ ہری پور پہنچا۔ آغا صاحب کے بقول: ''وہاں سرخ پوش جماعت کے ایک جم غفیر کو خان ولی خان کی سرکردگی میں موجود پایا جو استقبال کے لیے آیا تھا۔ باہر آنے پر شہزادہ اور محمد حسین عنقا کو ہار پہنائے گئے بلکہ کھڑے لوگوں نے ان پر ہاروں کی بارش کر دی۔ ولی خان انہیں پشاور کے قریب اپنے چارسدہ کے قیام گاہ تک ایک بے انتہا طویل جلوس کی شکل میں لایا۔ ولی خان نے رات کو ایک بڑی پُرتکلف ضیافت دی، جس میں تقریباً 400 افراد شریک ہوئے جو سب سرخ پوش تھے۔ ان سرخ پوشوں نے ایک ماہ تک ضیافتوں کو دوام دیا۔

''دو ماہ بعد یکم اگست 1956ء کو وہ لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور سٹیشن پر محمود علی قصوری صدر نیشنل پارٹی پاکستان نے ان کا استقبال کیا...... وہاں سے وہ کراچی پہنچے اور شہزادہ عبدالکریم، میر غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر نے طویل غور و خوض کے بعد ایک سیاسی جماعت ''استمان گل'' (عوامی پارٹی) کے قیام کا اعلان کر دیا۔ شہزادہ عبدالکریم اس کا صدر بن گیا اور میر محمد حسین عنقا جنرل

سیکرٹری۔اس پارٹی نے ایک متحدہ بلوچستان کا مطالبہ کیا(10)۔خان قلات نے اس مطالبے کی حمایت کی ۔ جب بلوچستان میں شورش بڑھ گئی تو چھ اکتوبر 1958ء کو پاکستانی افواج قلات میں داخل ہوگئیں۔خان قلات اور دیگر لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا۔

استمان گل اور پھر کالعدم نیشنل پارٹی بلوچستان کا جنرل سیکرٹری عنقا تھا ۔ 14 اکتوبر 1958ء کو عنقا کو تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 93 کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔لیکن الزامات کی نامعقولیت کے باعث عدالت نے اسے بری کردیا۔لیکن پھر 22 مارچ 1959ء کو ریاستی یونین کے دفعہ 3 کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ اِن قید و بند کی صعوبتوں سے چھٹکارا ملا ہی تھا کہ 26 اگست 1962ء کو اسے پھر گرفتار کرلیا گیا۔ مذکورہ گرفتاریوں کے دوران اسے قلّی کیمپ کوئٹہ اور لاہور قلعہ میں رکھا گیا۔قلّی کیمپ کیا تھا: ''سی کلاس کی مشقت، اٹھارہ سیر آٹا پیسنا، نو سیر مرچیں پیسنا، تیرہ ماہ آسمان کے تارے دیکھنا نصیب نہ ہونا............''(11)۔جون 1965ء میں اسے جیل سے رہائی ملی۔

جیلوں کی یونیورسٹی سے ہمارے عنقا نے ایف اے، بی اے اور ایم اے پاس کرلیے۔ اِن یونیورسٹیوں کے نام ہیں: ہری پور جیل، شاہی قلعہ لاہور، قلّی کیمپ کوئٹہ، ساہیوال جیل، کراچی، مچھ جیل اور ایبٹ آباد جیل۔

اس کا فارسی اور اردو مجموعہ کلام ''رحیل کوہ'' ہے۔جو 1933ء میں چھپا۔ بلوچی شاعری کی کتاب کا نام ''روخیں پُل'' ہے۔

عنقا کی شاعری کا موضوع و مطلب آزادی، سیاسی ساتھیوں کی تعریف اور وطن دوستی ہے۔اس کی عشقیہ شاعری بھی قابلِ توجہ ہے۔وطن کے بارے میں عنقا کا قول تھا: ''شہ درستیں گل زیبا جوان منی بلوچی ایں وطن'' عام و خاص کی زبان پر ہے۔

اس کے فارسی کلام کا ایک نمونہ:

چناں آمد ز یارِ من جواب آہستہ آہستہ
دعا از چرخ گردد مستجاب آہستہ آہستہ
دلِ بے چارہ ام گردد کباب آہستہ آہستہ
بہ ہجرِ تو نمی گریم چکد خونی کہ از چشمم

محفظِ راز لازم تا بہ چرخ آدم فرستد سگ
گریزد نیز شیطان و شہاب آہستہ آہستہ
چرا عنقا بہ عصرِ نیست لاہوتی بہ عصرِ ہست
نمی خوا ہم نزولِ انقلاب آہستہ آہستہ

اس نے 1974ء میں ''بلوچ قوم کے دورِ قدیم کی تاریخ'' نامی کتاب لکھی، جس کا دوسرا نام ہے: ''انقلابی بلوچ تاریخ''۔مگر ایک بہت بڑا کارنامہ عنقا صاحب کا یہ ہے کہ اس نے خیر و نیکی کے پیام بر شیخ سعدی کی بہترین کتاب ''گلستان'' کا منظوم بلوچی ترجمہ کیا۔(مگر بلوچ اسے پڑھتے ہی نہیں!)۔

ہمارا یہ افتخار اور بلوچوں کا یہ استقلال ستر برس کی عمر میں کینسر سے لڑتے لڑتے 21 اکتوبر 1977ء کو کوئٹہ کے سول ہسپتال میں انتقال کرگیا۔اسے اس کی جنم بھومی مچھ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

تقریباً ربع صدی بعد' میں بلوچستان سے سیکڑوں میل دور' مردان میں رات کے کھانے کے بعد ایک خوب صورت واقعہ سے دوچار ہوا۔ جب ضعیف العمر غلام جیلانی موٹی عینکیں لگائے اور لاٹھی ٹیکتے کمرے میں داخل ہوا تو تمام لوگ احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔اس خدائی خدمت گار بزرگ نے حاضرین سے پوچھا تم لوگوں میں ''بلوچ کون سا والا ہے؟''۔میں اس کی جانب بڑھا تو اس نے مجھے گلے لگایا، اور میری پیشانی کو دو دفعہ چوما اور پشتو میں بولا ''یہ بوسہ صرف اس وجہ سے دے رہا ہوں کہ تم بلوچ ہو اور محمد حسین عنقا کی قوم سے ہو۔اس عظیم انسان کے ساتھ 50 برس قبل میں نے ہری پور میں اکٹھے جیل کاٹی تھی''۔

غلام جیلانی نے تو 50 برس بعد اپنے تیئں بوسے کا اپنا قرض چکا دیا مگر مجھے اُس پیشانی کی اب تک تلاش ہے جو اِس بوسے کی واقعتاً حق دار ہو۔ وہ مقدس ماتھا کوہستانِ بلوچستان کے کس مقام پر ہے اور پتہ نہیں کب ملے گا؟ ۔ وہ ماتھا صرف ایک ہی ہے یا درجنوں، سیکڑوں ہزاروں ہیں؟!

حوالہ جات

1۔ جہانی، کارینا۔Poetry and Politics۔صفحہ 111

2۔ بلوچ، محمد حسین عنقا۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان، فروری 1967۔ صفحہ 37

3- خان، عبدالصمد خان۔ جلد نمبر 2۔ صفحہ 478

4۔ ایضاً

5- واجہ، ظہور الحسن: محمد حسین عنقا۔ ماھنامہ نوکیں دور۔ مئی جون 1993۔ صفحہ 25

6۔ عنقا، محمد حسین۔ بلوچستان جدید۔ 26 مارچ 1934۔

7۔ بلوچ، محمد حسین عنقا۔ بلوچی دنیا فروری 1967۔ صفحہ 37

8۔ نظامانڑیں، قادر بخش۔ انٹرویو دیا عبدالرسول نظامانڑیں کو۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ اکتوبر 2008۔

9۔ نصیر، گل خان۔ تاریخ بلوچستان۔ 2000۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 566

10۔ احمد زئی، نصیر خان۔ تاریخ بلوچ و بلوچستان جلد ہشتم۔ صفحہ 96

11۔ بلوچ، محمد حسین عنقا۔ بلوچی دنیا ملتان۔ فروری 1967۔ صفحہ 37

قادر بخش نظامانڑیں

(1996-1914)

نظامانڑیں‘ سندھ میں رہائش پذیر کروڑوں بلوچوں میں نسبتاً ایک چھوٹا‘ مگر بہت اہی اہم قبیلہ ہے۔ تاریخ میں میانی کی جنگ کا تذکرہ تو ہم سب نے پڑھا ہے۔ یہ جنگ انگریزوں کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اسی لڑائی کے بارے میں پڑھتے ہوئے آپ کو اس بہادر قبیلے کا نام ملے گا...... اور اس جنگ میں نظامانڑیوں کو شکست ہوئی تھی۔ ہر جنگ کی طرح انگریز کے خلاف جنگیں بھی زندگیوں کو لاشوں میں بدل ڈالتی رہیں۔ میامی کی جنگ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس جنگ میں جتنے بھی بلوچ مارے گئے ان میں بڑی اکثریت نظامانڑیوں ہی کی تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بلوچ قبائل کی نقل مکانی مغرب سے جنوب مشرق کی طرف رہی ہے۔ مگر نظامانڑیں لوگ ایسا کرنے کے بعد‘ ایک بار پھر مغرب کی سمت لوٹے۔ یعنی یہ قبیلہ مشرقی بلوچوں کے علاقہ ڈیرہ غازی خان سے‘ سندھ چلا گیا تھا۔

قیصر خان، میر قادر بخش نظامانڑیں کا جدِامجد تھا۔ قادر بخش ٹنڈو قیصر (سندھ) میں 23 فروری 1914ء میں پیدا ہوا۔ اس کا والد دین دار عالم شخص تھا اور سارا گھرانہ عبیداللہ سندھی سے متاثر تھا۔ (امین کھوسو بھی عبیداللہ سندھی سے متاثر تھا، یوسف عزیز مگسی بھی........... میں بھی، آپ بھی)۔

نظامانڑیں صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول میں ہوئی۔ پھر ’’مدرسہ

دارالرشاد' سے دینی تعلیم حاصل کی۔ جہاں سارے اساتذہ کٹر سامراج دشمن ہوا کرتے تھے۔ اور انگریز دشمنی کا درس دیا کرتے تھے۔ (کبھی کوئی پوچھے کہ بلوچ کی بطور قوم بڑی خصوصیت کیا ہے، تو اُس کا جواب یہ ہے کہ بلوچ قوم بطور قوم' سامراج دشمن رہی ہے!)۔ ہمارے نظامانڑیں صاحب نے جب اس مدرسہ میں داخلہ لیا تو یہ اس کی عمر کا اوائل تھا۔ ذہن ایسا صاف' جیسے سکول کی تختی ہو' جو چاہو لکھ ڈالو' زندگی بھر نقش ہو جائے...... پتھر پر لکیر۔

محض سامراج دشمنی کا درس ہی نظامانڑیں کے ماتھے پہ لکھی تقدیر نہ بنی بلکہ اُس کے مدرسے میں تو ہر وقت سورۃ النسائکی آیت، ''کیوں نہیں لڑتے خدا کی راہ میں مظلوم ومقہور مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے'' کا ورد ہوتا تھا۔ جی ہاں......مظلوموں ومقہوروں کی خاطر کیوں نہیں لڑتے، یہی لڑائی تو خدا کی راہ کی خاطر لڑائی ہے۔

اسی طرح اس مدرسے میں ہمہ وقت ''مجھے غریبوں کی محبت عطا کر'' اور ''مجھے غریبوں کے ساتھ زندہ رکھ، غریبوں کے ساتھ دنیا سے اٹھا اور غریبوں کی معیت میں روزِ قیامت کو اٹھا'' جیسی حدیثیں گونجتی تھیں۔ مدرسے میں بالشویک انقلاب (روس) کا ذکر اکثر آتا تھا۔ جو کہ جابروں، ظالموں اور سامراجیوں کی مخالفت اور آزادی کی تحریکوں کی حمایت کا مرکز تھا۔ یہ باتیں نظامانڑیں صاحب کے صاف وسادہ ذہن پر اس طرح بیٹھ گئیں کہ زندگی بھر کے لیے لائحہ عمل کا بنیاد بن گئیں۔ سامراج دشمنی، طبقاتی جبر، اور محنت کشوں کا استحصال کرنے والوں سے نفرت کے جذبات نے اس کے مستقبل کی راہ متعین کی۔ اور پھر وہ زندگی بھر اسی مشن کی تکمیل میں گیند کی طرح اِدھر اچھلتا رہا اُدھر لڑھکتا رہا۔ کبھی کسی فتح پور کے سنار میں اپنے شہہ مرید کی صورت دیکھ کر اس کی چاکری کی' کبھی کسی پیتل کو سونا دیکھا۔ پارے کی طرح بے قرار رکھتا ہے سوشلسٹ نظریہ......کتنا بے کل کر دیتا ہے مجبوروں مقہوروں کی خاطر جہد۔ واللہ! کتنا بڑا عذاب ہے عبیداللہ سندھی کے فلسفے کی ہمسری میں کسی منگل باغ کا ابھار............

نظامانڑیں صاحب تعلیم کی تکمیل کے بعد پرائمری سکول ٹیچر مقرر رہا۔ اس نے کالج نہیں پڑھا تھا۔ صرف ماسکو میں ڈیڑھ سال تک (مشرق کے محنت کشوں کی کمیونسٹ یونیورسٹی میں) تعلیم

حاصل کی۔ عبیداللہ سندھی کی آگ کو مقدروں نے زندہ جو رکھنا تھا، دائمی جو بنانا تھا۔ ماسکو ہی تھا وہ آتش کدہ۔ ایسا انرجائزر جس نے مصری خان کھیتران سے لے کر محمود درویش تک دنیا کے کونے کونے میں مزاحمت کرنے والے اور لڑنے والے مظلوموں کے دل گرما دیے۔ ایک نہیں ہزاروں دل......

نظامانڑیں صاحب کانگریس کی سامراج دشمن تحریک میں شامل ہوا۔ ہمارے اس بزرگ نے ملازمت کو لات ماردی اور 1930ء میں کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک میں عملی طور پر حصہ لیا اور خیر سے اسی برس اُسے پہلی بار جیل میں ڈال دیا گیا۔ 16 برس کی عمر میں............ بھئی اپنی اپنی قسمت ہے۔ محمد بن قاسم سترہ برس کی عمر میں سندھ کا حملہ آور بنا اور نظامانڑیں سولہ برس کی عمر میں سامراج دشمن۔ اللہ جسے چاہے عزت دے............ بہر حال، نظامانڑیں جیل گیا............ اور جیل تو بے عزتی سمجھی جاتی تھی۔

رہا ہوا تو کانگریس چلاتا رہا مگر کمیونزم کی کشش بالآخر اسے بائیں جانب گھسیٹ گئی۔ ''کیرتی'' اخبار کے مطالعے اور بھگت سنگھ کی پھانسی کے خلاف تحریک نے اس معاملے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ (بھگت سنگھ! نظامانڑیں کا بھگت سنگھ، سرجیت کا بھگت سنگھ۔ بھگت سنگھ کی شہادت نے درجنوں انسانوں کو متاثر کیا تھا)۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مزدور راہنماؤں اور کمیونسٹوں کی گرفتاریوں اور اُن پر قائم کردہ مقدمات مثلاً ''کانپور سازش'' کی تفصیل اور ان میں کمیونسٹ راہنماؤں کے بیانات نے بھی قادربخش کو متاثر کیا۔ ان بیانات میں انہوں نے تفصیل سے اپنے نظریات اور اصولوں کی تشریح کی، نظامانڑیں یہ بیانات پڑھتا رہا۔ اسی طرح اس کی کمیونسٹوں سے بالمشافہ ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ بالخصوص لاہور اور امرتسر کے کمیونسٹوں سے۔ جن میں عبداللہ صفدر قابلِ ذکر تھا۔ جو دس سال تک وہاں ماسکو میں کمیونسٹ یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا تھا۔

1933ء میں نظامانڑیں صاحب کی ملاقات اُس دور کے بلوچ آسمان پہ سب سے روشن ستارے میر یوسف عزیز مگسی سے ہوئی۔ اس نے مگسی صاحب کو واضح طور پر ایک سوشلسٹ انقلاب پسند پایا۔ مگسی اپنے طور پر، اپنی راہوں سے، اپنے تجربات سے گزر کر سوشلسٹ بنا تھا۔ (سوشلزم کی

جڑیں کہاں کہاں اور کس کس طرح پھیلتی ہیں!!)۔ صرف مگسی صاحب ہی نہیں بلکہ اُس کی موت کے ٹھیک دو برس بعد اُس کا قریب ترین رفیق امین کھوسو کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنا، اسی طرح ان کا ایک دوسرا ساتھی محمد حسین عنقا کمیونسٹ بنا۔ مگسی صاحب ہی کے ایک ساتھی قاضی داد محمد نے بلوچستان میں، اولین ریلوے مزدور یونین قائم کر کے سرخ جھنڈا لہرایا۔

اسی طرح نظامانڑیں کا خان عبدالصمد اچکزئی سے یارانہ تھا۔'' نوجوان عبدالصمد خان اپنے میوہ جات کی فروخت کے سلسلے میں حیدر آباد آتا تھا' جہاں ایک کانگریسی رہنما بھائی سچانند اُس کا آڑھتی تھا۔ اس نے ہی صمد خان سے مجھے ملایا تھا اور یہ تعارف بڑے دیرپا دوستانہ روابط میں بدل گیا''(1) (کہاں عنایت اللہ کاریز، کہاں بھائی سچانند، اور کہاں میامی کا قادر بخش!! نظریات کی اٹھکیلیاں تو دیکھو!)۔

سیلانی اور مہم پسند نظامانڑیں کو سوشلسٹ نظام دیکھنے کی خواہش میں سوویت یونین جانے کی سوجھی۔ پاسپورٹ تھا نہیں لہٰذا زیارتوں کے لیے ایران جانے کا ''زیارت پاس'' حاصل کرلیا۔ ہمارا یار کوئٹہ آیا، یہاں سے نال سے ہوتے ہوئے مشہد پہنچا۔ وہاں سوویت سفارت خانے گیا اور تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ایک ہفتے بعد ویزا ملا اور قادر بخش نظامانڑیں مارچ 1934ء میں ترکمانستان داخل ہوا۔ اشک آباد اور وہاں سے چھ دن سفر کے بعد ماسکو۔ راستہ بھر کمیونسٹ اس کی میزبانی اور مدد کرتے رہے۔ کومنٹرن نے اس کی پڑھائی کا بندوبست کیا۔ اس طرح خچروں، ٹرکوں میں طویل سفر کرنے والا علم کا یہ طالب ڈیڑھ برس (یعنی اگست 1935ء تک) وہاں رہا۔ ماسکو میں ''مشرق کے محنت کشوں کی کمیونسٹ یونیورسٹی'' میں اسے سیاسی اور مارکسی فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کا زبردست موقع ملا۔ بنیادی مارکسی تعلیم کے بعد ٹکسٹائل انڈسٹری اور ٹریڈ یونین کے بارے میں مزید سیکھنے کے لیے لینن گراڈ بھجوادیا گیا۔ چھ ماہ ماسکو، چھ ماہ لینن گراڈ کے بعد چھ ماہ ایک اور شہر میں تعلیم حاصل کی۔ حفاظت کے پیشِ نظر دستور یہ تھا کہ دنیا بھر سے آئے ہوئے طالب علم ایک دوسرے کو یہ کبھی نہ بتاتے تھے کہ وہ کس علاقے یا ملک سے آیا ہے۔ اس لیے تنہائی کا احساس شدید رہا۔ ماں کی جلانے والی یاد الگ ستاتی تھی۔ ویسے بھی سندھ کے رہنے والے گھر سے

ایک دن کی دوری کو بھی ''پردیس'' کہتے ہیں۔ لہٰذا ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ نظامانڑیں کو اس جنت نظیر ملک کی دستیاب بے شمار سہولتوں کے باوجود اپنا وطن اس قدر یاد آیا کہ پڑھائی چھوڑ کر اگست 1935ء میں واپس ہوا۔ ایک اور طویل سفر............ایک اور استادی والا سفر۔ اس بار براستہ ترکی، مصر اور پھر کراچی۔ بحری جہاز کے کراچی رکتے ہی سی آئی ڈی اسے پکڑ کر لے گئی۔ وہ پوچھ گچھ کرتے رہے، مگر بلوچ کی ایک ٹانگ............نظامانڑیں گویا روس گیا ہی نہیں۔ یونہی زیارتیں کرتے کرتے ایران سے اٹلی چلا گیا اور وہاں سے مصر اور اب کراچی۔ بچپنے لڑکپنے کی معافی تو مل سکتی ہے ناں!۔ لہٰذا اس کے بچپنے کو دیکھ کر اسے اس کی مہم جوئی پر محمول کر کے چھوڑ دیا گیا۔

نظامانڑیں کراچی میں ٹریڈ یونین سے متعارف ہوا۔ وہ بیک وقت ہاریوں کی تنظیم میں کام کرنے لگا۔ دوسرے دوستوں سے مل کر اس نے 1936ء میں ایک کسان کانفرنس منعقد کی۔ نظامانڑیں صاحب ہاری کمیٹی میں بھی تھا، کانگریس میں بھی۔ اور اب کمیونسٹ پارٹی بنانے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ دُھن کے پکے اس من موجی کی پاگلانہ محنت کے نتیجے میں 1937ء میں یہ پارٹی (سندھ بلوچستان کمیٹی) بنادی گئی۔ بانیوں میں محمد امین کھوسو کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ایک سال بعد غوث بخش بزنجو اور محمد حسین عنقا بھی کمیونسٹ پارٹی کے اِن بانیوں سے آن ملا۔ پہلی ہی میٹنگ میں نظامانڑیں صاحب کو پارٹی کا سیکرٹری چنا گیا۔ زیرِ زمین کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری!!۔ سندھ، بلوچستان کمیونسٹ پارٹی!!۔

گو کہ دنیا بھر میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ملک یا خطے کی کمیونسٹ پارٹی مکمل طور پر دیسی ہوتی ہے۔ عالمی نظریات عالم گیر بنیادیں ہی رکھیں گے......البتہ سچ یہ ہے کہ سندھ بلوچستان کمیونسٹ پارٹی بنی مکمل طور پر دیسی انداز میں۔ پارٹی کا رابطہ بہت دیر تک کسی بھی پڑوسی ملک سے نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں اس کے بانی لوگ بھی، اور بعد میں آنے والے لوگ بھی سندھ کے اصلی باشندے تھے، یا خالص بلوچ تھے۔ ہر طرح سے مقامی پارٹی۔

سندھ بلوچستان کمیونسٹ پارٹی گویا بلوچستان کی آئندہ کی جمہوری تحریک کی بانی پارٹی ثابت ہوئی۔ اس کے اثرات زبردست طور پر بلوچستان کے شہری و دیہی علاقوں پر پڑے۔ اور کئی

مہذب دل و دماغ اس فکر کی طرف راغب ہونے لگے۔

اسلم اچکزئی اور شہزادہ عبدالکریم ایسے ہی متاثرہ لوگوں میں سے تھے۔آغا عبدالکریم کی سربراہی میں چلنے والی سیاسی گوریلا تحریک میں سوشلزم اور کمیونزم نمایاں نظریہ تھا۔اس تحریک کی طرف سے جو منشور تیار کیا گیا وہ اسی طرح کا تھا۔آغا صاحب اور اس کے تمام ساتھی مارکسی نظریات کے حامی تھے۔ بعد میں میر گل خان نصیر بھی کمیونزم سے بہت متاثر ہوا۔اور یہ سلسلہ کمال خان شیرانی، عبداللہ جان جمالدینی اور خدائیداد اور اُن کے شاگردوں ساتھیوں میں جاری و ساری رہا۔ اور آج تک جاری ہے۔

نظامانڑیں صاحب ایک طرف تو بلوچ اور کمیونسٹ پارٹی کا بانی اور لیڈر تھا اور ساری زندگی ان دونوں باتوں کی ترقی و بہبود کے لیے کام کرتا رہا۔اور اس نے اِن دونوں موضوعات پر لکھا بھی بہت۔وہ ایسی باتیں سامنے لایا، جن کے گم ہونے کا خدشہ تھا۔

اس نے وہ واقعہ دنیا کو نوٹ کرایا جب سرداروں کی طرف سے 1939ء میں مستنگ میں قلات نیشنل پارٹی کے جلسے پر مسلح حملہ کرایا گیا۔مگر اس واقعہ کی خبر اخباروں نے شائع نہ کی۔ نظامانڑیں صاحب نے بمبئی سے نکلنے والے ہفتہ روزہ کمیونسٹ جریدہ ''نیشنل فرنٹ'' (والیوم دو، شمارہ 13، مورخہ 7 مئی 1939ء) میں اس حملہ کے بارے میں ایک رپورٹ بنا کر بھیجی جو صفحہ اول پر شائع ہوئی اور ہندوستان بھر میں اس کی تشہیر ہوئی۔(2)

نظامانڑیں صاحب اس دوران مختلف اخبارات میں کام کرنے لگا۔ایڈیٹر و پبلشر محمد امین کھوسو کے سندھی ہفت روزہ ''آزاد''، ''الوحید''، سندھی ہفت روزہ ''آزاد سندھ''، سندھی ماہنامہ ''آج کل'' میں بھی۔اس نے 1949ء میں کمیونسٹ پارٹی کا پرچہ ہفت روزہ ''صداقت'' سندھی زبان میں جاری کیا۔نورالدین سرکی بھی اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ چھ ماہ بعد سرکار نے اسے بند کر دیا۔

1971ء میں اس نے سندھی ہفت روزہ ''اخبارِ وطن'' کا اجرا کیا۔یہ بھی چھ ماہ ہی چل سکا۔1972ء میں قادر بخش نظامانڑیں، اکبر بارک زئی کے ہم راہ کابل چلا گیا۔نور محمد ترہ کی وہاں

تھا۔ظاہر ہے اُس سے ملاقاتیں رہیں۔کچھ دن گزار کر وہ دونوں بغداد چلے گئے، جہاں بغداد ریڈیو سے بلوچی پروگرام نشر ہوتا تھا اور بغداد میں اسلحہ سازش تیار ہوئی تھی۔بعد میں لندن سے مئی 1973ء میں انگریزی ماہنامہ 'پیپلز فرنٹ' جاری کیا۔ جو چار سال تک جاری رہا۔ پھر مالی مشکلات کے باعث بند ہو گیا۔1978ء میں ''پیپلز فرنٹ'' ماہنامہ کے بطور اردو میں جاری کیا۔دو تین سال بعد پیسہ نہ ہونے کی بنا پر بند ہو گیا۔80-1979ء میں لندن ہی سے ''ندائے بلوچستان'' شائع کیا۔86-1985ء میں اکبر بارک زئی کی ادارت میں ماہنامہ ''آزاد بلوچستان' جاری ہوا۔ ایک سال بعد ادارت نظامانڑیں صاحب نے سنبھالی۔یہ رسالہ 1990ء تک جاری رہا۔

نظامانڑیں صاحب کی کتابوں میں سندھی زبان میں ''میانی جی جنگ'' قابلِ ذکر ہے۔ دوسری ''سندھ جو سفر'' ہے۔پھر ایک سفر نامہ کا ترجمہ ''لطف اللہ جی ڈائری'' شائع کیا۔

نظامانڑیں صاحب تو سندھ بلوچستان کمیونسٹ پارٹی کا بانی ہے۔وہ یوسف عزیز مگسی کے ابتدائی رفیقوں میں شامل رہا۔یوسف علی خان کی سیاسی تنظیم کاری سے پہلے نظامانڑیں اور عنقا کراچی میں ملے تھے۔عنقا' نظامانڑیں ہی سے متاثر ہو کر روشن فکر سیاست سے جڑ گیا اور ایک طرح سے کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوا۔پھر ان دونوں نے مل کر بلوچستان میں پارٹی اثرات بڑھائے۔(3)

نظامانڑیں جیکب آباد و حیدر آباد دونوں بلوچ کانفرنسوں میں شریک ہوا۔(4) اس طرح سے اسے جائز طور پر یوسف عزیز مگسی کا ہم عصر سمجھا جاتا ہے اور اُسی دور کی تفصیلات میں اُس کا تذکرہ لایا جاتا ہے۔یہ دور جب اپنے دوسرے مرحلے میں داخل ہوا تو مگسی صاحب اور اس کا طریقِ سیاست بھی بدلا اور بلوچ قومی تحریک اپنے ارتقائی مرحلے میں داخل ہوئی۔ نظامانڑیں صاحب یہاں بھی موجود تھا۔

1939ء میں میر صاحب نے شادی کی۔اور 1940ء میں اُس کے ہاں پہلی اولاد ہوئی۔

دوسری عالمی جنگ 1939ء میں شروع ہوئی۔اس زمانے میں ہند کمیونسٹ پارٹی اور اس کی تمام شاخیں غیر قانونی تھیں' اور زیر زمین کام کرتی تھیں۔یہی صورت سندھ بلوچستان کمیٹی کی تھی۔ یہاں کی ہماری کمیونسٹ پارٹی، دنیا بھر کی دیگر کمیونسٹ پارٹیوں کی طرح اس عالمی جنگ کو

سامراجی مفادات کی جنگ تصور کرتی تھی اور اس جنگ کے خلاف سرگرم تھی۔ واضح رہے کہ اس وقت تک سوویت یونین پہ حملہ نہیں کیا گیا تھا۔ سوویت یونین جو دنیا کا واحد سوشلسٹ ملک تھا۔ مزدوروں کسانوں کی امیدوں کا مرکز۔ 21 جون 1941ء میں جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر ہی دیا۔ یعنی ایک ایسے ملک پر جس کے چاہنے والے دنیا بھر میں موجود تھے۔ ایک نئے نظام و نظریے کا ملک جو کُل جہاں کے کم زوروں کی توقعات کا ملک تھا۔ اس حملے سے جنگ کی نوعیت بدل گئی، اور دنیا بھر کی سامراج دشمن تحریکیں ایک نیا موڑ لیتی ہیں۔

سوویت یونین دنیا کا واحد ملک تھا جہاں سیاسی اقتدار محنت کش عوام کے ہاتھ آ چکا تھا۔ اس لیے دنیا بھر میں اس کے ہمدرد موجود تھے۔ جنہیں اُس ریاست کی تباہی منظور نہ تھی۔ چنانچہ سات ہی روز بعد یعنی 28 جون کو سندھ بلوچستان کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ اتفاق رائے سے قرارداد منظور کی گئی جس میں نازی جرمنی کی طرف سے سوویت یونین پر حملے کو دنیا بھر کے محنت کش عوام کے خلاف فسطائیوں اور نازیوں کا اعلان جنگ قرار دیا گیا۔ پارٹی کا مطالبہ تھا کہ اب نازی جرمنی کو شکست دینے کے لیے محنت کش طبقات کو دنیا بھر میں متحد ہونا چاہیے اور اتحادیوں کی جنگی کوششوں کی بلامشروط حمایت کرنی چاہیے۔

کمیونسٹ پارٹی سندھ بلوچستان کمیٹی کا یہ فیصلہ شاید دنیا بھر میں اولین تھا۔ اور جب ہندوستان کی زیرِ زمین مرکزی پارٹی کو یہ فیصلہ بھیج دیا گیا تو انہوں نے اس فیصلے کی سخت مذمت کی۔ مرکزی پارٹی نے سندھ بلوچستان کمیٹی کے فیصلے کو یہ کہہ کر غلط قرار دیا کہ جنگ سوویت یونین والوں کے لیے عوامی ہو گئی ہے، مگر ہمارے لیے ابھی تک جنگ کی مخالفت کرنا لازم ہے۔ پارٹی نے اس ''جرم'' میں اگست 1941ء میں نظامانڑیں صاحب کو پارٹی سے نکال دیا............ یہ دوست نہ صرف پارٹی سے نکال دیے گئے بلکہ اِن سامراج دشمن آزادی پسندوں پر تو انگریزوں کا ایجنٹ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ ہم اس سلسلے میں بلوچستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی جناب بابو عبدالکریم امن کی مثال دیں گے جس نے 22 جون 1941ء ہی کو یعنی سوویت یونین پر حملہ کے ایک ہی دن بعد کوئٹہ کے میکموہن پارک میں ایک جلسہِ عام کیا تھا۔ اور اعلان کیا کہ'' فاشسٹوں کی طرف سے

سوویت یونین پر حملے کے بعد یہ جنگ اب سامراجی نہیں عوامی جنگ بن چکی ہے''۔ پوتّر نظریات بلا کی جرأت بخشتے ہیں انسان کو۔ اس جرأت پہ اپنے ہی رفقا نے (جنہیں اس تبدیلی کی سائنسی وجوہات کا اندازہ نہ ہو سکا) بابو عبدالکریم شورش کو انگریز کا ایجنٹ کہا۔

مگر چھ ماہ بعد نومبر 1941ء میں کلکتہ میٹنگ کے اندر ہندوستان کی مرکزی کمیونسٹ پارٹی خود ہی اسی نتیجے پر پہنچی جس پر کہ سندھ و بلوچستان کے لوگ پہنچے تھے۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ پارٹی نے ایک اچھے ورکر کو خود سے دور کر دیا تھا۔ نظامانڑیں پھر دوبارہ عملاً کبھی بھی اس پارٹی میں فعال نہیں ہوا۔ (واضح رہے کہ نظامانڑیں 1937ء سے لے کر 1941ء تک پارٹی کا سیکرٹری رہا)۔ یہ تھا نظامانڑیں کا بلوچ سیاست کے دوسرے دورے میں رول!

ابھی مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ عالمی جنگ کا مناقشہ جاری تھا کہ ایک اور مصیبت آن پڑی۔ مذہب کے نام پر ایک الگ ریاست بنانے کا غوغا ہوا............ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو لگتا ہے اللہ نے ہدایت کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے اس نے 1942-43ء میں پاکستان کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نظامانڑیں نے کہا، ''ہم پاکستان کی حمایت نہیں کریں گے۔ پارٹی کہے تب بھی نہیں کریں گے۔'' (5)

چنانچہ نظامانڑیں 1943ء اور 1944ء میں بلوچستان چلا آیا اور بلوچستان کی قومی تحریک میں سرگرم و متحرک ہوا۔ وہ کوئٹہ سے ہوتے ہوئے قلات گیا جہاں وہ ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کے پاس ٹھہرا۔ خواجہ خیل صاحب قلات کا وزیر تھا۔ نظامانڑیں وہاں سے تربت چلا گیا۔ آغا عبدالکریم وہاں گورنر تھا، نظامانڑیں ملک محمد سعید تحصیل دار کے پاس ٹھہرا۔

وہ ایران جانے کے لیے فروری 1948ء کے اواخر میں تربت گیا اور مکران کے گورنر شہزادہ عبدالکریم سے اپنی اولین ملاقات کی۔ اُس زمانے میں بلوچستان میں ایک ہی تو بحث تھی: پاکستان سے بلوچستان کے الحاق اور نہ الحاق کی بحث۔ اور اس میں شہزادہ اور نظامانڑیں ایک ہی مؤقف رکھتے تھے...... ''NO''۔ بہت سنجیدہ، حتمی اور ہٹ دھرم No۔ آغا اُس وقت پاکستان سے لڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

نظامانڑیں تربت سے مند چلا گیا، پھر پشّین (ایرانی بلوچستان) گیا۔ اوروہاں سے راسک ۔ وہیں پراس نے ریڈیو پر سنا کہ خان احمد یار خان نے پاکستان کے ساتھ قلات کے الحاق نامے پر دستخط کرڈالے۔ اپریل کے پہلے ہفتے میں وہ صاحب واپس تربت لوٹا۔ وہاں پتہ چلا کہ آغا عبدالکریم ملک سعید اور سٹیٹ فورس کے چند اراکین کو ساتھ لے کر قلات روانہ ہوگیا۔ نظامانڑیں کو ایک ٹرک میں جگہ ملی ۔ وہ آغا عبدالکریم کے پیچھے پیچھے قلات چلا گیا مگر وہاں معلوم ہوا کہ آغا، مستنگ چلا گیا۔ نظامانڑیں اسی ٹرک پر مستنگ آیا۔ وہاں آغا اور عنقا سے اس کی ملاقات ہوئی ۔ جنہوں نے افغانستان جانے اور بلوچ اکثریتی علاقے میں مرکز بنا کر قومی آزادی کی جنگ لڑنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ نظامانڑیں دو دن ٹھہر کر کراچی آیا تا کہ اپنے کچھ مسائل درست کرلے ۔ وہاں اخبارات کے ذریعے معلوم ہوا کہ آغا عبدالکریم نے سرکار کی عہد شکنی کے انداز کو پسند نہ کیا اور وہ آزادیٔ وطن کی خاطر لڑنے کے ارادے سے سرحد پار کر کے افغانستان جاچکا۔

محمد حسین عنقا، ملک محمد سعید، عبدالواحد کرد، محمد خان رئیسانی اور کئی مذہبی علما اس کے ساتھ افغانستان چلے گئے ۔ دو ہفتے بعد سندھ ہاری تحریک کا ایک رہنما مولوی نذیر حسین اور قادر بخش نظامانڑیں افغانستان میں آغا صاحب سے جا ملے ۔(6) اور بلوچستان کی اس اولین سیاسی گوریلا جنگ میں شامل رہے۔ یہاں اس کا نام یوسف رکھا گیا۔ اسے افغان حکومت کے ساتھ گفت وشنید کے لیے شہزادہ کریم کا ایلچی بنا کر ملک سعید کے ساتھ افغانستان بھیج دیا گیا۔ جب ملک سعید اور نظامانڑیں واپس ہوئے تو نہ کیمپ تھا نہ باغی لوگ...... بارڈر کراس کرتے ہوئے ملک سعید ملیشیا کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ ملک سعید کے شور مچانے پر نظامانڑیں (یوسف) خبردار ہو کر نکل بھاگا اور چھپ چھپ کر سندھ پہنچا۔

بعد میں جب شہزادہ گرفتار ہو کر ہری پور جیل میں ڈال دیا گیا تو نظامانڑیں جا کر شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا سے جیل میں ملاقات کر آیا تھا۔ وہ شہزادہ کے ہاتھ کا لکھا ایک خط بھی لایا تھا جو بلوچ نوجوانوں کے نام تھا، جس میں شہزادہ نے تلقین کی تھی کہ ترقی اور نجات کا واحد راستہ مارکسزم اور سوشلزم ہے ۔(7)

سوانح نگاروں کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نظامانڑیں صاحب کو کس دور کے بلوچ انقلابیوں کا ہم عصر قرار دیا جائے ۔ یوسف مگسی اور امین کھوسو سے اُس کی رفاقت ایک پورے عہد پر مشتمل تھی ۔ پھر وہ شہزادہ عبدالکریم کے شانہ بشانہ گوریلا جنگ میں شامل رہا۔ اسی طرح صمد خان، اور گل خان جیسے ہمارے اکابرین کا اتالیق وہم رکاب رہا۔ وہ 14 جولائی 1955ء میں استمان گل بنانے والوں میں موجود تھا۔ بزنجو صاحب اس کا بہت ذکر کیا کرتا تھا۔ پھر وہ عبداللہ جان جمالدینی کا استاد بھی تھا اور ہم عصر بھی۔

الغرض، کہاں نہ تھا یہ شخص ۔ اب دیکھ لیجیے کہ مگسی صاحب کا عہد بالکل ایک الگ دور ہے بلوچ سیاست کا۔ بزنجو کا زمانہ بالکل جدا حیثیت کا حامل ہے۔ عبداللہ جان اور اس کا حلقہ بالکل جدا سیاست اور جدا زمانے سے تعلق رکھتا ہے ۔ مگر نظامانڑیں اِن سب میں مشترک ہے ۔ تسلسل کا دھاگہ ہے۔ بظاہر کہیں نہیں ہے، مگر اصل میں ہر جگہ موجود ہے ۔ میں بھی حیران ہوں کہ اسے بلوچ سیاست کے کس مرحلے کا ہم عصر کہوں اور اُس مرحلے کی تفصیل اُس سے منسوب کروں؟ اسے کہیں بھی محدود نہیں رکھ سکتا۔

مختصر ترین حقیقت یہ ہے کہ قادر بخش نظامانڑیں بلوچ سیاست سے ہی جڑا رہا۔

وہ اگست 1953ء میں سوویت یونین کے سفارت خانہ کے دفتر اطلاعات میں ملازم ہو گیا۔ اور دسمبر 1969ء تک یہ ملازمت جاری رکھی۔

پچھلی صدی میں ساٹھ کی دہائی میں کراچی میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن قائم کی گئی تھی۔ اس کے قیام میں اُن بلوچ نوجوانوں کا بڑا حصہ تھا جو کراچی میں زیر تعلیم تھے۔ اور ان میں سے اکثر نظامانڑیں سے ملا کرتے تھے۔ نظامانڑیں نے نوجوانوں سے مل کر خفیہ تنظیم بھی بنائی تھی جو اُن نوجوانوں کی سیاسی تربیت کرتی تھی اور بلوچ قومی تحریک کے سلسلے میں آمریت کے مظالم اور دہشت گردی سے پردہ اٹھانے میں مدد کرتی تھی ۔ انھی نوجوانوں کے ذریعے نشر واشاعت اور پمفلٹ وغیرہ کی تقسیم یہ لوگ سب مل کر کرتے ۔ ابتدا میں ان کی چھپائی نظامانڑیں صاحب روسی سفارت خانے میں ہی کرتا تھا، جس کا روسیوں کو علم ہی نہ تھا۔(8)

یہی بلوچ ترقی پسند سیاست میر قادر بخش نظامانڑیں کو مارچ 1973ء میں برطانیہ پہنچاتی ہے۔ وہ 1975ء تک دو سال تک اکیلا کام کرتا رہا۔ پھر بلوچ قومی تحریک کے کاز میں ہاتھ بٹانے اکبر بارکزئی 1975ء میں وہاں پہنچا۔ بعد میں سردار عطا اللہ مینگل وہاں گیا۔ آگے چل کر افضل بنگش، حفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو سے مل کر اس نے سندھ بلوچ پشتون فرنٹ بنایا۔

میر قادر بخش نظامانڑیں' نامی چھلاوے سے میری ملاقات نوے کی دہائی کی ہے۔ شخصی ملاقات سے قبل وہ میرے رسالے ''نوکیں دور'' میں تحریریں بھیج کر میرے لیے قابلِ برداشت بنا۔ (کہ میں پہاڑی جانور حفیظ پیرزادہ، ممتاز بھٹو اور نظامانڑیں میں تمیز ہی نہیں کرسکتا تھا اور بھیڑیوں سے بہت بدکتا تھا)۔ اور اس کے بعد روبرو ماما جمالدینی کے گھر ملاقاتیں رہیں۔ میں اپنے دل میں اس کی غلطیوں پر پشیمان ہوتا تھا اور وہ اپنے دل میں میری ناتجربہ کاری پر کڑھتا تھا۔ اب وہ نہیں ہے تو اسے یہ بتانے کی سبیل ہی نہیں کہ میں نے اپنا نقطۂ نظر بدل دیا ہے اُس کی غلطیوں کے بارے میں۔ قحط سالی میں کوئی بھی جان دار اپنے نظریاتی وجود کی بقا کے لیے اتنے ہی جتن کرتا ہے، اتنے ہی پینترے بدلتا ہے۔

نظامانڑیں صاحب نے جتنی بھی تحریریں مجھے ''نوکیں دور'' میں چھاپنے کے لیے بھیجیں اُن سب میں اپنا نام ''قادر بخش نظامانڑیں بلوچ'' لکھا۔ بلوچ سے اس شخص کو عشق تھا۔(9) اسے ہی نہیں مگسی کو بھی، کرد کو بھی، گل خان کو بھی، بزنجو کو بھی، عبداللہ جان کو بھی......

اُس کی جو بھی تحریریں ''نوکیں دور'' میں چھپی تھیں وہ نئی نسل کو یہ بتانے کی تھیں کہ اُن کے اسلاف کون تھے، اُن کے اکابرین نے کیا کیا کام سرانجام دیے اور اُن کی سیاسی تاریخ کیا کہہ رہی ہے۔

نظامانڑیں کی زندگانی جدوجہد سے بھرپور رہی۔ وہ بلوچوں کے اندر نہ صرف کمیونسٹ تحریک کا بانی اور متحرک رکن رہا بلکہ وہ یہاں کمیونزم کی تاریخ کا اولین مؤرخ بھی ہے اور شارح بھی۔ اُس کے بہت سے انکشافات بلوچ تاریخ کی تکمیل میں میرا سہارا رہے ہیں۔ اسی کے طفیل میں نے جانا کہ بزنجو کب کمیونسٹ بنا، بلوچستان میں اولین کمیونسٹ پارٹی کب قائم ہوئی، آغا

عبدالکریم کے ''شہزادہ سے کمیونسٹ'' بننے تک کا پورا عرصہ کیسے گزرا............ نظامانڑیں صاحب نے اس طرح کی بے شمار بنیادی معلومات ہمارے سماج کو بخشی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ قادر بخش نظامانڑیں ہی تھا جس نے لینن کی بلوچوں سے محبت کے بارے میں بتایا۔ باکو کانفرنس میں بلوچوں کے وفد کی شرکت کے بارے میں بھی ہماری معلومات کا سرچشمہ نظامانڑیں صاحب ہی ٹھہرا۔

خط وکتاب کے علاوہ میری اولین ملاقات اُس سے اور اس کی فیملی سے 1995ء میں ہوئی جب وہ کچھ دنوں کے لیے کوئٹہ آیا تھا، میر عبداللہ جان سے ملنے۔

میر قادر بخش نظامانڑیں 27 ستمبر 1996ء میں انتقال کر گیا۔

اس کا اکلوتا بیٹا دوستین ہے۔ اس کی چار صاحبزادیاں ہوئیں۔ ایک بیٹی محترمہ طاہرہ ہے جو کہ بلوچی کے ممتاز شاعر اکبر بارکزئی کی بیگم ہے۔ دوسری بیٹی کا نام شہناز ہے جو ڈاکٹر شاہ بخش لاشاری کی بیگم ہے......ایک بیٹی اُس کے بھانجے نور خان سے بیاہی ہوئی ہے۔

حوالہ جات

1۔ نظامانڑیں، قادر بخش۔ خط بنام انور جان 93-10-19۔ غیر مطبوعہ

2-، عبدالرسول۔ قادر بخش نظامانڑیں سے انٹرویو۔ غیر مطبوعہ سے ملنے۔

3- جمالدینی، عبداللہ جان۔ لٹ خانہ۔ صفحہ 169

4- جمالدینی، عبداللہ جان۔ پیش لفظ۔ موہن جوڈرو کا جوگی۔

5- نظامانڑیں، عبدالرسول سے انٹرویو

6۔ نظامانڑیں قادر بخش۔ خط بنام انور جان۔ 93-10-19۔ غیر مطبوعہ

7- جمالدینی عبداللہ جان۔ لٹ خانہ۔ صفحہ 164

8- نظامانڑیں، عبدالرسول۔ قادر بخش سے انٹرویو۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ جولائی 2008

9۔ گچکی، نعمت ڈاکٹر۔ ایڈیٹر سنگت کو خط۔ اکتوبر 2008۔

چرواہا شہزادہ

آغا عبدالکریم خان

آغا عبدالکریم کی سوانح عمری پر ایک زبردست مضمون جناب قادر بخش نظامانڑیں نے لکھا تھا۔جس کی دو ذیلی سرخیاں ہی آغا صاحب کی زندگی کا جامعیت کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لیے کافی ہیں؛ ایک عنوان ہے: ''ایک اور شہزادہ جو شہزادگی چھوڑ کر عوامی راہ پہ چل نکلا''۔

اور دوسرے مضمون کا عنوان تھا: ''جنگ جو قوم پرستی سے انقلابی مارکسزم تک''۔(1)

آغا عبدالکریم پاکستان سے قبل ریاستِ بلوچستان کا کمانڈر اِن چیف رہا۔ پھر مکران کا گورنر ہوا۔ وہ جوانی میں ایک غصیلے، جابر اور رعب و دبدبے والا حکمران رہا۔ اُس کے اُس دور کے ظلم کے قصے ابھی تک مکران میں لوگوں کے دماغوں زبانوں پر موجود ہیں۔ کسی بھی فیوڈل حکمرانی کے ظلم و جبر سے زیادہ ظالم و جابر حکمران۔ مگر جب منصب و اقتدار چھوڑ دیا اور قومی مقاصد کے لیے میدان میں اترا تو مکمل انسان کے بطور جیا۔ اچھے انسانوں کا ہیرو بنا۔

1947ء کے اواخر اور 1948ء کے اوائل میں نیا نیا بنا پاکستان اپنے بقیہ سارے کام چھوڑ، قلات کو اپنے اندر ضم کرنے میں لگ پڑا۔ ظاہر ہے یہ دھندا بلوچوں کو اچھا نہ لگا۔ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اچھی بھلی اور دیرینہ ریاست سے کیسے دست بردار ہوا جا سکتا تھا۔ مگر جب سازش و زور و دھمکی ایک انسان کی برداشت سے بڑھ گیا تو خانِ قلات نے یہ معاملہ قلات کی پارلیمنٹ کے

سامنے پیش کیا۔ تاکہ قوم کو ایک متفقہ فیصلہ کرنے دیا جائے............اور بلوچستان کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے اسے رد کر دیا۔

اُس وقت خان قلات کا چھوٹا بھائی شہزادہ عبدالکریم' مکران کا گورنر تھا اور تربت میں متعین تھا۔ (آغا عبدالکریم کی تعلیم کراچی میں ہوئی تھی)۔ آغا عبدالکریم نہ صرف خان کا سگا بھائی تھا بلکہ وہ اُس کا ہم زلف بھی تھا۔ دونوں کی شادیاں افغانستان کی شاہی نژاد خواتین سے ہوئی تھیں۔

پاکستان کی بیوروکریسی اور سیاست کار قلات کو اپنے اندر ملانے کے لیے عرض داشت، غراہٹ، سازش اور پیسہ سب کچھ کا استعمال کرتے رہے۔ مگر اُنہیں ناکامی ہوئی۔ تب اُنہوں نے بلوچستان کو اندر سے تارپیڈو کرنا شروع کر دیا۔ پہلے تو 17 مارچ 1948ء کی رات کو خاران' لسبیلہ اور مکران کے علاقوں کو ریاست قلات سے چپکے چپکے کاٹ دیا گیا، انہیں پاکستان میں بھرتی کر دیا اور نواب بائی خان گچکی کو ''امیرِ مکران'' کے لقب سے علاقہ مکران کا والی مقرر کر دیا (امیر صاحب، میر صاحب اور پیر صاحب ......بلوچ القابات و اعزازات پر مرمٹتا ہے!!)۔ بالآخر 27 مارچ 1948ء کو آدھی رات کے وقت خان احمد یار خان سے الحاق نامے پر زبردستی دستخط کروا دیے۔ خان نے نہ صرف الحاق کر کے بلوچوں کی امیدوں کو تاراج کیا بلکہ اس نے تو حکومتِ پاکستان کے حکم کی تعمیل میں میر غوث بخش بزنجو، مولانا محمد عمر پڑنگ آبادی، مولانا عرض محمد اور میر گل خان کو گرفتار کیا۔ ملک فیض محمد یوسف زئی سیکرٹری ٹرانسپورٹ، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل ناظم قلات، بہرام خان لہڑی وزیر مال، لال بخش مینگل وزیر تحصیل دار، سید احمد شاہ تحصیل دار اور ملک محمد پناہ تحصیل دار اور بیسیوں چھوٹے موٹے ملازموں کو ان کے عہدوں سے نکال دیا۔ اس نے صرف یہاں تک بس نہ کیا بلکہ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی پر پابندی بھی لگا دی۔

اس زور آوری اور بے نوری پر بلوچ بہت بدظن ہوئے۔ اور خان فیملی کا اپنا نوجوان بلوچ شہزادہ' عبدالکریم ان فریبی ہتھکنڈوں کا' کافر بنا۔ انکار جیسی مہذب صفت انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ایک نشان، ایک علامت ہے۔ مگر انکار بہر حال ایک قیمت رکھتا ہے جسے چکانا پڑتا ہے۔ اور، جرأتِ کفر کا خمیازہ تو وہی بھرے گا جو اس کے شایانِ شان ہو......البتہ اس کا ناپ تول

اُس وقت عوام کرتے ہیں مگر بعد میں مؤرخ، مصنف اور شاعر۔

آغا عبدالکریم نے گورنری، شہزادگی، اور آرام کو لات مادی اور وہ تربت سے سیدھا قلات پہنچا۔ وہاں اپنی بیوی بچوں سے ملے بغیر وہ خانِ قلات سے ملنے گیا۔ مگر مذاکرات کو ناکام سمجھ کر وہ 16 مئی 1948ء کو مستنگ چلا آیا۔ اور اسی رات لاری میں سوار ہو کر 17 مئی 1948ء کو کردگاپ پہنچا۔ وہاں سے لاری کو واپس کیا گیا اور کیمپ کا سامان، خیمے اور راشن وغیرہ کو اونٹوں پر لادا گیا۔ شبِ تاریک کے اس چراغ نے افغانستان کی سرحد پار کرلی، اور اگلے دن سرلٹ پہنچ کر کیمپ لگایا اور بلوچ قومی آزادی کے حصول کے لئے مسلح جدوجہد کا کیا۔ اس شہزادے کی آسودہ زندگی کو ٹھوکر مار کر عوامی راہوں پر چل، پڑنے ایک حکمران سے ایک پختہ سوشلسٹ انقلابی میں بدلنے تک اس کے ذہنی ارتقا کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ برطانیہ کو نکال باہر کرنے کے بعد یہ بلوچوں کی اولین گوریلا جنگ تھی۔ شہزادہ عبدالکریم مسلح جدوجہد کرنے کے اس فیصلے میں اکیلا نہ تھا۔ بہت سے دیگر لوگ بھی اُس کے ساتھ ہولیے۔ جن میں بلوچ لیگ کے سیکرٹری اور ہفت روزہ 'بولان' کے ایڈیٹر محمد حسین عنقا، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے سیکرٹری ملک سعید دہوار، سندھ بلوچستان کمیونسٹ پارٹی اور بلوچ لیگ کے سربراہ قادر بخش نظامانڑیں اور جمعیت علمائے بلوچستان کے مولوی محمد افضل شامل تھے۔

اُن لوگوں کا سرحد پار جانا تھا کہ قلات کے باشندوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اور بظاہر بے سرقوم، اور گنبدِ بے در والی صورت حال کے باوجود مختصر عرصے میں تقریباً 5000 مسلح افراد سرلٹ کے مقام پر شہزادہ کے پاس جمع ہو گئے۔ (2) غیرت وحمیت اور وقار و آزادی کی نگہبانی میں چلنے والی قوم کے ان سرکردہ لوگوں نے صوبہ قندہار کے ضلع شوراوک کے سرلٹ پہاڑی علاقہ میں ایک کاریز کے پاس کیمپ قائم کیا۔ انہوں نے قوم پرست سیاسی پارٹیوں...... قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی، بلوچ لیگ اور بلوچ نیشنل ورکرز پارٹی کو بھی اس جنگ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ یہ لوگ خود کو ''بلوچ مجاہدین'' کہلوانے لگے۔ ان مجاہدینِ آزادی نے قومی، ثقافتی اور مذہبی نظریات کو اپنے کاز کے لیے راہنما بنایا۔ یہ لوگ بلوچ سرداروں اور معتبرین کو پیغامات بھیج کر اس مسلح تحریک میں شامل

ہونے کا کہتے تھے۔ بلوچستان میں سچ ظاہر کرنے کی انہوں نے ایک مہم شروع کی جس کا مطلب عوام کو ایجوکیٹ کرنا تھا۔ انہوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے حقوق کی خاطر لڑنے کے لیے اِس قومی آزادی کی فوج میں اپنا نام درج کرائیں۔ انہوں نے جن لوگوں کو پیغامات بھیجے، ان میں میر غلام فاروق رودینی، سردار محراب خان، سردار میر جمعہ، اور میر وزیر خان سنجرانی شامل تھے۔

شہزادہ عبدالکریم' بلوچ مجاہدین کا سپریم کمانڈر تھا جس میں ریاستِ قلات کی فوج کے سابقہ سپاہی اور افسر بھی شامل تھے۔ اصول یہ بنا کہ جو شخص سو آدمی بھرتی کر لیتا اسے میجر کا عہدہ دیا جانا تھا اور جو شخص 50 سپاہی بھرتی کرواتا اسے کیپٹن کا عہدہ ملنا تھا۔ اس فوج میں ایک خفیہ ایجنسی ہوتی تھی جسے ''جاں نثار'' کہتے تھے۔ اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ معلومات لائے، سرکار کے رسل و رسائل کے نظام کو تباہ کر دے اور غداروں کی حرکات پر نظر رکھے۔ غداروں کو قتل کرنے کا خفیہ یونٹ 'جاں باز' تھا۔ 'جاں نثار' کی مجموعی تعداد تیس تھی۔

یہ لوگ کیمپ میں باقاعدہ سوشلزم کا مطالعہ کرتے تھے۔ انقلابِ روس سے متعلق کتابیں اور بالخصوص لینن کی تحریریں زیرِ مطالعہ اور زیرِ بحث رہتی تھیں۔

جس مقام پر اِن لوگوں نے اپنا کیمپ لگایا تھا بلوچ' وہاں سے سو میل مغرب میں آباد تھے۔ یہ علاقہ خالص پشتون علاقہ تھا۔ جب وہاں کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ آنے والا ایک شہزادہ ہے تو انہوں نے کیمپ کی جگہ اور کاریز کے پانی کا معاوضہ طلب کیا۔ اُدھر افغان حکومت نے بہت دلچسپ پالیسی اپنا رکھی تھی۔ یہ حکومت گوریلا کیمپ قائم کرنے کی تو مخالف تھی مگر بلوچوں کے شہزادے کو بطورِ آغا کو پناہ گزین رکھنے پہ آمادہ تا کہ وہ بڑی عزت کے ساتھ، مگر پُرامن طور پر اپنی جلاوطنی کی زندگی گزار سکے۔

بلوچوں کا ایک وفد حکومت افغانستان کو اپنا مؤقف بتانے قندھار چلا گیا مگر اسے ایسا کرنے میں ناکامی ہوئی۔ تب یہ فیصلہ ہوا کہ ایک دوسرا وفد کابل جا کر مرکزی حکام سے ملے۔ یہ بھی طے پایا کہ کابل جانے والا وفد قومی آزادی کی کونسل کا نمائندہ ہوگا۔ اِس کونسل کا ایک منشور' کابل میں مقیم سفارتی نمائندوں کو اور دنیا کی سیاسی تنظیموں کو بھیجا جائے تا کہ بلوچ قومی تحریک کے لیے

عالمی ہمدردیاں حاصل ہو سکیں۔لیکن، قادر بخش نظامانڑیں اور ملک سعید کی کوششوں کے باوجود بین الاقوامی برادری نے مسلح لڑائی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اُس پر دوسری بدقسمتی یہ ہوئی کہ خود یہاں بلوچستان میں' قلات نیشنل پارٹی نے بھی مسلح لڑائی میں سرگرم دلچسپی نہ لی۔تیسرا مسئلہ یہ ہوا کہ پنج پائی کے محاذ پر پشین سکاوٹ اور کردگاپ کی طرف ژوب ملیشیا اور پاکستان کی فوج کو مقرر کیا گیا تا کہ اِس طرف سے شہزادہ کو مزید نفری اور راشن نہ پہنچ سکے۔ آزادی پسندوں کو خان قلات سے جس خفیہ ہمدردی کی توقع تھی، وہ بھی بر نہ آئی۔ان تمام وجوہات کی بنا پر شہزادہ کی سپاہ کو بہت مشکلات در پیش ہوئیں اور کیمپ چلانا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

میر قادر بخش نظامانڑیں اس تحریک کا ساتھی تھا ہی۔اسی طرح اس تحریک میں ایک اور بڑا آدمی بھی شریک تھا جس کا نام مولوی نذیر حسین تھا۔وہ جتوئی بلوچ تھا۔جتوئی صاحب کا تعلق لاڑکانہ سے تھا۔وہ عالم دین اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔وہ اس سے قبل ہاری کمیٹی میں بھی مستقل طور پر رہا۔ اسے بلوچ قومی تحریک اچھی لگی اور یوں آہستہ آہستہ وہ نظامانڑیں سے متفق ہوا اور 1948ء میں وہ سرلٹ آن کر بلوچ قومی تحریک میں شامل ہو گیا۔(3)

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس قومی تحریک میں فکرِ سوشلزم و کمیونزم بہت نمایاں تھا۔خود آغا عبدالکریم اور اس کے دیگر اہم ساتھی مارکسی نظریات رکھتے تھے۔اور بالخصوص' اس تحریک کا منشور اسی سوچ کا عکاس تھا۔

اس دوران 24 مئی 1948ء کو حکومتِ پاکستان کے دباؤ میں آ کر خان قلات نے ایک فرمان کے ذریعے اپنے بھائی شہزادہ عبدالکریم اور اس کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا۔اور عوام سے ان لوگوں کے ساتھ روابط نہ رکھنے کی ہدایت کی۔ اُدھر پاکستان آرمی افغان سرحدوں کے قریب اپنی چوکیاں قائم کر چکی۔حکمتِ عملی یہ تھی کہ آزادی پسندوں کا راشن وغیرہ بند کیا جا سکے۔اس دوران کم از کم دو جھڑپوں کی تصدیق پاکستانی حکام نے کی تھی۔

یہ کیمپ تین ماہ تک قائم رہا۔بالآخر ہر طرف سے دل برداشتہ ہو کر انہوں نے طے کر لیا کہ اندرونِ ملک واپس چلے جائیں اور جھالاوان کے علاقے کو مرکز بنا کر قومی تحریک کو بلوچستان بھر

میں پھیلائیں۔

چنانچہ 1948ء میں اگست کے پہلے ہفتے آغا عبدالکریم اپنی فورس کے ساتھ واپس بلوچستان کی سرحدوں میں داخل ہوا۔ پاکستانی فوج نے اسے کچھ نہ کہا۔مگر قومی آزادی کی فوج جب منگوچر کے مقام پر قلات جانے کے بجائے کوہِ ماران کا رخ کر بیٹھی جہاں سے وہ جھالاوان جانے لگی۔تب فوج حرکت میں آئی۔اس فوج کی قیادت میجر جنرل اکبر خان کر رہا تھا جو کہ پاکستان آرمی کی ساتویں رجمنٹ کا انچارج تھا۔کشان کے مقام پر جنگ ہوئی میجر جنرل اکبر خان (جو بعد میں جنرل اکبر خان (رنگروٹ) ہوا)' نے دو تحریریں اِس جنگ پر لکھیں۔ایک تو وہ مضمون ہے جو Early Reminiscences of a Soldier کے نام سے 14 اگست 1960ء کو روزنامہ 'ڈان' میں آزادی ضمیمہ کے بطور چھپا۔دوسری تحریر اُس کی وہ کتاب ہے جو 'میری آخری منزل' کے عنوان سے اردو بازار لاہور کے 'الفیصل' نامی ادارے نے چھاپی۔یہ دونوں چیزیں مجھے محترم احمد سلیم نے مہیا کیں۔جنرل لکھتا ہے کہ:

''مجھے ایک کانفرنس میں بتایا گیا کہ پرنس کریم بارہ ہزار افغان لشکر کے ساتھ پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے(پاکستان کے جاسوسی ادارے اُس زمانے میں بھی اتنے ہی لاعلم لوگ تھے جتنے کہ وہ آج ہیں)۔.............انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میری مدد کے لیے لاہور سے دسویں ڈویژن کے دو بریگیڈ اور کراچی سے براستہ پسنی دو بٹالین بھیجے جائیں گے۔ پاکستان بحریہ بحری جہازوں سے ساحل پر گشت کر کے ساری فوج اور فوجی سامان کو پسنی بندرگاہ تک پہنچا کر تعاون کرے گا۔ پاکستان فضائیہ کا ایک سکواڈرن میری کمان میں ہوگا۔اس سکواڈرن کو جب بھی آپ چاہیں رسال پور سے کوئٹہ بھیجا جائے گا.........جس وقت میں کوئٹہ ایئر وڈروم پہنچا تو مجھے قائداعظم کی طرف سے ایک رقعہ ملا جس نے مجھے فوراً زیارت میں ملنے کا حکم دیا۔کرنل گلزار بھی ایروڈروم پر مجھ سے ملا اور میں نے زیارت روانگی سے پہلے اس سے صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔دراصل کریم کا لشکر پہلے ہی پاکستان آ چکا تھا اور 7 بلوچ کی ایک کمپنی بہت باریکی سے اس کی نگرانی کر رہی تھی.........قائداعظم نے مجھ سے تفصیلات سننے کے بعد بلوچستان اور اس کی ریاستوں کو شورش

زدہ علاقہ قرار دیا اور اسے آٹھویں ڈویژن کے جی او سی یعنی، میرے حوالے کر دیا۔

''یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ میں نے ساتویں بلوچ بٹالین کو ریاست پر مارچ کرنے کا حکم دیا۔ میری ہدایات کے مطابق کرنل گلزار احمد نے کچھ اونٹ حاصل کیے۔ ہم نے ان پر جنگی سامان لادا اور فیصلہ کیا کہ ریاست میں اس طرح داخل ہوا جائے کہ کسی کو ہم پہ شک نہ پڑے۔ ہماری سپاہ نے بلوچ کارواں کا لباس پہنا۔ اس لیے نہ تو انہیں دیکھا گیا اور نہ ہم پر شک ہوا............ پاکستان کے اِن دشمنوں کو دھوکہ دینے کے لیے میں نے ظاہر کیا کہ میں اپنی فوجیں قلات میں مرکوز کروں گا اور لشکر کے علاقے میں پہنچنے کا انتظار کر کے اُن پر حملہ کروں گا۔ اپنے ارادوں کو مزید چھپانے کی خاطر میں نے اُس ضیافت میں شرکت کی دعوت قبول کر لی، جو خان قلات نے ہماری فوجوں کے اعزاز میں دی تھی، اُس رات جب میں بڑے واقعات رونما ہونے کی توقع کر رہا تھا۔ فوک رقص اور بینڈ اس ضیافت کے اہم آئیٹم تھے۔

''............ میں نے اپنے اے ڈی سی کیپٹن بخاری کی اس رپورٹ کا انتظار کیا کہ حملہ کرنے کا وقت کب ہے۔ جب بخاری سے مطلوبہ اشارہ ملا تو میں نے خانِ قلات سے اجازت لی۔ میں اپنی کار میں سیدھا اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں اپنے کمرے میں گیا اور پچھلے دروازے سے منتظر جیپ میں کھسک گیا۔

''اس دوران کرنل گلزار پر ہیجانی لمحات آئے۔ دشمن کو ہماری فوجوں کی خبر ہوگئی اور اس نے سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ قبل بلوچ انفینٹری کو دیکھ لیا۔ ساتویں بلوچ تین کمپنیوں کی کمی سے مشکل میں تھا۔ کمپنی کمانڈر ایک عمودی پہاڑی پر چڑھتے ہوئے شدید زخمی ہوا۔ لہٰذا کرنل گلزار نے کمپنی کمان سنبھال لی۔''

''............ لشکر نے سورج ڈوبنے سے پندرہ منٹ قبل بلوچ کمپنی پر حملہ شروع کر دیا۔
.... دشمن کو سخت جانی نقصان ہوا۔ کرنل گلزار نے پہاڑوں کا کنٹرول سنبھال لیا''(4)۔ اور شہزادہ عبدلکریم اپنے 142 ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گیا۔ گرفتار شدہ لوگوں میں میر محمد حسین عنقا، میر عبدالواحد، مولوی محمد افضل مینگل، صوبیدار عبدالرحمٰن، محمد خان رئیسانی، مولوی فتح محمد، ملک محمد

سعید، مولوی فقیر محمد، مولوی داد محمد، مولوی محمد اسماعیل اور مولوی اللہ یار شامل تھے(5)۔'' بعد میں 14 اگست 1960ء میں جنرل اکبر خان نے روزنامہ 'ڈان' کے مضمون میں یہ دلچسپ بات لکھی۔''......
اِس لڑائی کی خبر قائداعظم نے پریس میں رپورٹ نہ کرنے دی''۔(6)

شہزادہ اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد انہیں فوج کی نگرانی میں قلات لایا گیا اور اُسی رات فوج کی کڑی نگرانی میں انہیں کوئٹہ اور مچ کے جیل خانوں میں لے جایا گیا۔ اس کے بعد اے جی جی نے ایک انکوائری کا حکم دیا۔ یہ انکوائری کوئٹہ کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ عبداللہ خان نے کی اور 12 ستمبر 1948ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس کی رپورٹ شہزادہ کی سرگرمیوں اور لبریشن فوج کی جانب سے خطوط اور پمفلٹوں پر مبنی تھی۔ انکوائری کے بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کوئٹہ' آر کے ساکر نے ایک خصوصی جرگہ تشکیل دیا۔ جس میں پشین کا صاحب زادہ محمد ایوب خان عیسےٰ خیل، لورالائی کا باز محمد خان جوگیزئی، پشین کا عبدالغفار خان اچکزئی، قلات کا وڈیرہ نور محمد خان، قلات کا سید اورنگ زیب شاہ، ژوب کے شیخ باز گل خان، زیارت کے وہاب خان پانیزئی، اور سبی کے سردار دودا خان مری شامل تھے۔ 10 نومبر 1948ء کو جرگہ نے ملزموں کا بیان سنا اور 17 نومبر کو اپنی سفارشات دیں۔ جس میں شہزادے کو قلات سے لورالائی یا ژوب بدر کرنے کی سفارش کی گئی۔ اور یہ کہا گیا کہ جب حکومت پاکستان کو یہ اطمینان ہو کہ شہزادہ کا رویہ اب حکومت سے ٹھیک ہو گیا تب اسے قلات واپسی کی اجازت ہو۔

مگر ''بے چارے'' جرگہ کی اس رائے کو سرکار نے مسترد کر دیا۔ بجائے اس کے کہ شہزادہ کو لورالائی یا ژوب میں نظر بند کیا جائے' ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے 27 نومبر 1948ء کو اپنے حکم میں شہزادہ کو دس برس مشقت کی جیل سنا دی اور 5000 روپیہ کا جرمانہ بھی کر دیا۔ (اُس وقت کے 5000!!)۔ خیر سے یہ عدالت سینٹرل جیل مچ میں منعقد ہوئی تھی۔(7)

محمد حسین عنقا کو بھی دس برس کی قید با مشقت، اور ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ ان دونوں قیدیوں کو سزائے قید بھگتنے کے بعد بالترتیب دس ہزار اور پانچ ہزار روپے کی ضمانت دینی تھی کہ وہ مزید تین سال کے لیے ''نیک چلن'' رہیں گے۔(8)۔ مولوی محمد افضل مینگل، ملک سعید

اورعبدالواحد کرد کو سات سات سال قید، پانچ سو روپے جرمانہ اور بعد از قید 5000 روپے کی ضمانت دینی ہوگی کہ وہ تین سال تک ''نیک چلن'' رہیں گے۔ میر محمد خان رئیسانی، نائب تحصیل دار تین سال قید، دو سو روپے جرمانہ اور بعد از قید تین سال تک نیک چلنی کی ضمانت۔ صوبیدار عبدالرحمٰن سمالانڑیں پانچ سال قید، پانچ سو روپے جرمانہ اور بعد میں تین سال تک کی نیک چلنی کے لیے دو ہزار روپے کی ضمانت۔ مولوی عبدالرحمٰن، مولوی فقیر محمد، مولوی اللہ یار، مولوی داد محمد، مولوی محمد اسماعیل، مولوی فتح محمد اور رحمت اللہ فی کس پانچ سال قید، دو دو سو روپے جرمانہ اور ایک ہزار روپے کی ضمانت نیک چلنی تین سال کے لیے۔ ٹکری محمد وفا شہوانی، ٹکری پسند خان سرپرہ، ٹکری محمد وفا لانگو کو دو دو سال قید، دو دو سو جرمانہ اور ایک ہزار روپے کی ضمانت نیک چلنی تین سال کے لیے۔ ٹکری فتح محمد سرپرہ جمعدار تھانہ کردگاپ، محمد عمر اور منگل خان سوار فی کس ایک ایک سال قید، پچاس پچاس روپے جرمانہ اور تین سال تک نیک چلن رہنے کے لیے پانچ پانچ سو روپے کی ضمانت۔ (9)

سوجیل............ بادشاہ کا بھائی' مکران کا گورنر اور بلوچ قومی تحریک کا سربراہ جیل۔ جیل جہاں آغا نے انگریزی زبان کا خوب مطالعہ کیا اور اس زبان میں مارکسزم پڑھا۔ چھ ساڑھے چھ برس کی جیل کے بعد اس نے نظامانڑیں کو ایک خط میں لکھا:

''............جرمنی کی سرزمین سے ایک بے نظیر شخصیت (مارکس) نے مسائل کو اس طرح حل کر دیا کہ انسان کو انسان کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا سبق دے دیا اور اُس سربستہ راز کو جو ہزاروں برس سے محتاجِ افشا تھا کھول کر ظاہر کر دیا۔ جس نے اس وقت تقریباً آدھے کرہِ ارض کو درندگی سے نجات دلا کر انسانیت کی طرف گامزن کر دیا ہے......

''ان دنوں اپنا تو یہ حال ہے کہ سوائے مذکورہ نظریہ کے باقی جتنے بھی نظریے یا جماعتیں ہیں وہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہیں کہ انسانوں کو دھوکا دے دیں' ظلم کریں اور انسانیت کو حیوانیت میں تبدیل کریں''۔

اپنے اسی خط میں قیدی شہزادہ اپنے آئندہ کے عزائم یوں لکھتا ہے: ''............مدتِ قید پوری کر کے باہر آنے کے بعد سب سے پہلے فنڈز کا انتظام کرنا ہوگا۔ پھر آل پاکستان بنیادوں پر

بلوچ تنظیم قائم کریں گے اور اس کے لیے انگریزی اور اردو میں اخبار جاری کیا جائے گا''۔

اس نے نظامانڑیں ہی کے نام ایک اور خط بلوچی میں لکھا۔ اس نے فرمائش کی کہ اس خط کی کاپیاں بنا کر ہم نوا بلوچوں کو پہنچائی جائیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتا ہے: ''......موجودہ عہد میں واضح ہو چکا ہے کہ مارکسی نظریات کی روشنی میں چلنے والی جماعت ہی کسی قوم کو اس کی آزادی اور ترقی کی طرف رہبری کر سکتی ہے۔ میں تمام بلوچ بھائیوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہوں گا کہ مارکسزم کے علاوہ کسی دوسرے نظریے کے ساتھ نہ ہم اپنی بلوچ قومی تحریک کو بین الاقوامی حقیقت دلا سکیں گے نہ ہی اپنی قوم کو دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا کر سکیں گے۔ مارکسزم کے علاوہ دوسرا کوئی بھی نظریہ صرف قومی رسوائی اور شکست کی طرف لے جائے گا............'' (10)

آغا عبدالکریم نے سزا کی اپنی مدت پوری کی' اور رہا ہوا۔ اسے ایوب کے مارشل لا میں پھر گرفتار کر لیا گیا اور اب کے اس نے دس برس جیل کاٹی۔ اس دوران چرخِ گردوں کی ایک ہی کجروی کے نتیجے میں بنے' حاکموں نے اپنی اصلیت دکھاتے دکھاتے ہر شعبہِ زندگی کو اپنی پستی کی مطابقت عطا کر دی تھی۔ سماج بہت نیچے پیچھے گیا مگر قیدی تو بہت ارفع بہت افروز ہوا۔ ضمیر کا قیدی!!! اسے خدائی خدمت گاروں اور کمیونسٹوں کی صحبت نصیب ہوئی، وفادار اور سچے سچے ملاقاتی ملے، باشرف کتابوں نے اسے مطالعہ کا عادی بنا دیا' اور یوں یہ بات سیاسی حلقوں میں خوشی سے سنی گئی کہ شہزادہ عبدالکریم کو دس سال کی طویل قید کے بعد ہائی کورٹ نے رہا کر دیا۔

ہمارا یہ ممدوح جب جیل سے رہا ہوا تو وہ ایک سوشلسٹ انقلابی بن چکا تھا۔ رہائی پر وہ کوئٹہ نہیں گیا، نہ ہی بیوی بچوں سے ملنے قلات گیا بلکہ جیل سے رہا ہو کر وہ سیدھا کراچی چلا گیا۔ وہاں ''استمان گل'' نامی ترقی پسند پارٹی قائم کی اور تب گھر' قلات آیا۔ ایک دو ہفتہ آرام کیا، پھر ''استمان گل'' کی تنظیم کاری میں مصروف ہو گیا۔ عوامی بیداری کی مہم شروع کی اور ملک کے دورے شروع کیے۔ اپنے سیاسی مقاصد کا اعلان کیا۔ آغا عبدالکریم ایوبی مارشل لا میں پھر گرفتار ہوا (جی ہاں' بلوچ ہونا اور 'باعمل بلوچ' ہونا مشکل ترین بات ہے!)۔

قیدی کے دکھ کو نہ بھی دیکھیں تو اس کی اولاد، اُن کی تعلیم، اُن کی پرورش، ایک عورت کی

زندہ خاوند والی بیوگی......الحفیظ، الامان۔ اب کی رہائی کیا رہائی تھی، امیدیں، قویٰ، صلاحیتیں سب جیل خانے کی نذر ہو گئیں۔ زمینداری اجڑ چکی تھی، باغات سوکھ چکے تھے اور گھر کھنڈر............لوگوں کو تاریخ کے ترازو میں رکھتے ہوئے ان کی جیلوں کا شمار ضرور کرنا چاہیے، وگرنہ محض حقیر تذکرہ بھیانک طور پر سطحی نتائج دے گا۔

شہزادہ کا دل، دماغ، امنگ، لپک جھپٹ سب کچھ جیل کی دیواروں کی اینٹیں کھا گئیں۔ ایک لاش'ایک مردہ سماج میں واپس کر دی گئی۔ درمیانہ قد، گہری سانولی رنگت' ملیشیا رنگ کے کپڑے اور ایک چھوٹی خاکی پگڑی والے ایک انقلابی میں ڈھلے ہوئے اس شخص کے پاس اب ایک ہی سیاسی میدان موجود تھا: وہ تھی بے ساز و بے ڈول نیشنل عوامی پارٹی (NAP)۔ سو اُس میں داخل ہوا۔ بلوچستان صوبائی اسمبلی کا اولین ممبر بنا............مگر اُس وقت تک آغا' عرفان (اُس کے بیٹے کا نام بھی ہے) کی اُس منزل تک پہنچ چکا تھا، جہاں یہ سب کچھ اسے بہلاوے کے سوا کچھ نہ لگا۔ گوکہ بعد میں اس کی ایک بیٹی (پروین) اور بیٹا (آغا عرفان) صوبائی وزیر بنے اور دوسری بیٹی (ریحانہ) سینیٹر۔ مگر جیل نے، اور مارکسزم کے مطالعہ نے عبدالکریم کو کچھ اور ہی سکھلا دیا تھا۔ کیا بورژوا اسمبلی، کیا فیوڈل کروفر؟ چنانچہ آغا نے وزیر و مشیر بننے سے انکار کر دیا۔ اتنی بڑی نیشنل عوامی پارٹی محض ایک فرد کے لیے چھوٹی نکلی۔ وہاں تو 16 مارچ 1968ء کے اجلاس میں پارٹی سربراہ تین گھنٹے تک اس قرارداد کی حمایت کرتے رہے کہ اِس پارٹی کا کوئی کارکن کسانوں اور محنت کشوں کی تنظیم نہیں بنائے گا، نہ اس میں کام کرے گا اور نہ ہی کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم کا کوئی رکن NAP کا رکن رہ سکے گا۔(11)

1985ء میں سندھی بلوچ پشتون فرنٹ بنا۔ اس نے کنفیڈریشن کا مطالبہ کیا۔ آغا اس کا کنونیئر تھا۔ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ مگر گھپ اندھیرے میں آغا جیسا چھلاوہ کیا کر سکتا تھا۔ ایک آدھ ٹامک ٹوئیاں ماریں، دل نہ مانا، اُس نے حرکت ہی بند کر دی اور آغا کراچی کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گیا۔ (4 جولائی 1986ء)۔

بلوچ قلم مکار کی نا اہلی اور تاریخ کے دیگر جھمیلے دنیا کو یہ بتا ہی نہ سکے کہ بلوچوں کے اس

کمیونسٹ اور قومی آزادی کے مجاہد نے کل 17 برس قید میں گزارے۔

آغا نے وصیت کی تھی کہ اس کی میت قلات میں خوانین کے قبرستان میں نہ دفنائی جائے۔ چنانچہ وہ کوہنگ میں محو استراحت ہیں۔ وہی ٹیلا جو:

''کسی کے باپ کی میراث نہیں، اسے بلوچوں نے شمشیروں سے حاصل کیا ہے!''(12)

حوالہ جات

1۔ نظامانی۔ قادر بخش۔ ''جنگجو قوم پرستی سے انقلابی مارکسزم تک''۔ نوکیں دور۔ شمارہ 9۔ 1995۔ صفحہ 30-38

2۔ نصیر، گل خان۔ تاریخ بلوچستان۔ سال اشاعت 2000۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 524

3۔ نظامانی، عبدالرسول۔ نظامانی سے انٹرویو

4۔ اکبر خان، میجر جنرل۔ Reminiscences of a Soldier۔ روزنامہ ڈان 14 اگست 1960 یوم آزادی کا ضمیمہ صفحہ viii

5۔ ہاشمی، سید نوید حیدر۔ بلوچستان عالمی قوتوں کے نرغے میں۔ 2008۔ العصر پبلی کیشنز لاہور۔ صفحہ 44

6۔ اکبر خان، میجر جنرل۔ Reminiscences of a Soldier ۔ روزنامہ ڈان 14 اگست 1960 یوم آزادی کا ضمیمہ صفحہ viii

7۔ نصیر، گل خان۔ تاریخ بلوچستان۔ 2000۔ صفحہ 567

8۔ نظامانی، عبدالرسول۔ نظامانی سے انٹرویو

9۔ نصیر، گل خان، تاریخ بلوچستان۔ صفحہ 527

10۔ نظامانی............''جنگجو قوم پرستی سے............

11۔ ہفت روزہ ''پارس'' لاہور۔ یکم اپریل 1968

12۔ خان عبداللہ خان قہار کی شاعری سے لیا گیا۔

میر عبدالرحمان بگٹی

(1939-1907)

ژوب میں میرے محبّ اور قریبی بزرگ دوست کمال خان شیرانی کے علاوہ ایک کمال دین شیرانی بھی گزرا ہے۔ دونوں ''کمالات'' نے ایک جیسی سیاست سے شروعات کی، اور مشہور ہوئے۔ کمال خان سیاست و فلسفہ ولٹریچر میں کمال کو پہنچا جب کہ کمال دین بعد میں لٹریچر پہ ہی مرکوز رہا۔ ان دونوں کی شہرت اور ناموں کی یکسانیت کی وجہ سے ڈاک والا ایک کا خط دوسرے کو دیا کرتا تھا، اور ایک کا منی آرڈر دوسرے کو۔

آخری عمر میں تتلا کر بات کرنے والے میرے اس بزرگ کمال دین شیرانی کے پاس میر عبدالرحمان بگٹی کے دو پرانے خط بہ حفاظت رکھے ہوئے تھے۔ کس محبت سے اُس نے وہ خطوط مجھے دکھائے تھے۔ اُس کی آنکھوں کی اُس وقت کی چمک مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ ان خطوط میں اگر ایک طرف بگٹی قبیلہ کے نواب کے سب سے بڑے بیٹے کی غربت ایک ایک لفظ سے چھلکتی تھی تو دوسری طرف اور بلوچستان کے ساتھ محبت ایک ایک حرف سے۔ پرانی دستاویزات اور خطوط بہ حفاظت رکھنے والا کمال دین فوت ہوگیا، میں اُن خطوط کو فوٹو سٹیٹ نہ کرسکا جن سے پہلی بار میر عبدالرحمان بگٹی سے میں متعارف اور متاثر ہوا تھا۔ (ہئے بے بختی!)۔

اُس سوچ کو کوبرا سانپ لڑے جو ڈیرہ بگٹی اور ژوب کی عوامی انسانی تحریک کے بیچ

دیواریں کھڑی کرے۔ روایت روایت چیخنے والے بلند آہنگوں نے ہماری اولین روایت کو لتاڑ کر تقریباً کچل ڈالا ہے، جہاں جھل مگسی کے راز گلستان میں، اور سنگسیلا کے مسودات ماڑیں خوا میں محفوظ ہوا کرتے تھے۔

میر عبدالرحمان، نواب محراب خان بگٹی کا بیٹا تھا۔ اس کا سن پیدائش 1907ء ہے۔ اس نے تحصیل داری سے آغاز کیا۔ اُس دور میں کوئی بلوچ ملازمت کرتا ہوٗ اور میر عبدالعزیز کرد کی انجمنِ اتحاد بلوچاں سے متاثر نہ ہوٗ یہ ممکن ہی نہ تھا۔

میر عبدالرحمٰن 1931ء میں اس تنظیم میں شامل ہوا۔ یہ تنظیم پڑھے لکھے بلوچوں پر مشتمل تھی۔ یہ شعور کو ہمیشہ جگاتے بڑھاتے رکھنے کا ذریعہ تھی' اور سوشلزم تک پہنچنے کا زینہ تھی۔

اگر آپ تاریخ میں ڈیڑھ دو صدی پیچھے جائیں تو معلوم ہو گا کہ 79-1878ء میں افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے انگریز فوج ڈیرہ بگٹی کے راستے سے ہو کر گزرتی تھی۔ پنجاب سے ڈیرہ غازی خان اور اور پھر کوہستانِ بگٹی اور خود شہر ڈیرہ بگٹی سے۔ عزیز بگٹی کے بقول: ''اس فوج اور اس کے سامانِ رسد کو سلامت پہنچانے میں سردار اور تمن بگٹی نے خوب مدد دی، جس کے صلہ میں سردار شہباز خان کو نواب بنادیا گیا''۔(1)

بعدازاں 15 جنوری 1917ء کو ''نواب''، سر شہباز خان بگٹی کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے محراب خان کو قبیلے کا سردار بنادیا گیا اور علاقے میں حکومتِ برطانیہ نے کامیابی کے جھنڈے مزید مضبوط کردیے۔ نواب بگٹی کو انگریز سرکار نے تعاون کرنے پر لوئر باری دوآب (پنجاب) میں پانچ سو ایکڑ اراضی بطور انعام دے کر سی بی ای کا خطاب دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ مگر 1922ء میں نواب بگٹی کو سی ایس آئی کے خطاب سے نوازا گیا تاکہ نواب محراب خان کو زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل ہوں اور بگٹی قبیلے کو انگریزوں کے خلاف مزاحمت سے دور رکھا جاسکے۔ اس سامراج دشمن بہادر قبیلے کو انگریز کے خلاف مزاحمت نہ کرنے دینا اگر ایک طرف انگریز کا کمال تھا تو دوسری طرف یہ بلوچ قوم کے لیے المیہ تھا۔

نواب محراب خان بگٹی کی سرداری کے دوران جس وقت یہ بڑے بڑے واقعات

ہو رہے تھے تو اُس وقت اُس کا ایک ہی بیٹا تھا، میر عبدالرحمان۔ اور خوش قسمتی دیکھیے کہ نواب بگٹی کے اس ارجمند بیٹے کو ایک ایسی صحبت نصیب ہوئی جس کے اندر نواب یوسف عزیز مگسی، میر عبدالعزیز کرد، ملک فیض محمد یوسف زئی اور میر محمد حسین عنقا شامل تھے۔ جی ہاں، نواب زادہ عبدالرحمان بگٹی 'انجمن اتحادِ بلوچاں' میں شامل ہو گئے۔ یہ پارٹی سامراج کی قسم کھائی ہوئی دشمن تھی اور اپنے وطن بلوچستان کو دوبارہ آزاد کروانا چاہتی تھی۔

نوابزادہ عبدالرحمان نے انجمن کے منشور پر عمل کرتے ہوئے اپنے قبیلے کے اندر سامراج دشمنی کی تحریک شروع کر دی۔ ایک بہادر، نوجوان اور نواب کا اکلوتا بیٹا جب ایک انقلابی تحریک شروع کر دیتا ہے تو پھر عوام میں مقبولیت تو اُس کا اور اُس کی تحریک کا مقدر بنتی ہے۔ نواب زادہ عبدالرحمٰن کی للکار ایک تحریک بنی اور تحریک بہت مقبول ہوئی۔ جس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اسے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدے سے برطرف کیا گیا تھا۔ انگریز نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اُس نے سارا زور عبدالرحمٰن کے والد پر لگایا۔ وڈیرے اور معتبرین پہلے ہی اُس کے اپنے تھے۔ چنانچہ جھٹ ایک جرگہ بلایا گیا ڈیرہ بگٹی میں۔ انگریز، سردار اور معتبرین نے مل کر عبدالرحمٰن کو باغی قرار دے دیا۔ اسے 'آقا دشمن' کہا۔ وہ سرداری والی جانشینی سے معزول ہوا اور تمام جائیداد سے عاق کر دیا گیا۔ صرف یہ نہیں بلکہ انصاف اور عدل کے علم بردار انگریز کے اس جرگے نے میر عبدالرحمان کو ڈیرہ بگٹی سے جلاوطن کر دیا۔ (سات سمندر پار سے آیا ہوا انگریز 'محبّ وطن بگٹی کو جلاوطن کرتا ہے!!)۔ ایک دلچسپ گنجائش البتہ یہ رکھی گئی کہ اگر نواب زادہ بلوچ سیاست سے دست برداری کا اعلان کرے اور انگریز سے باقاعدہ معافی مانگ لے تو جرگہ اسے معاف کر سکتا ہے۔ مگر انقلابی نظریات کا پیالہ پیے ہوئے نواب زادہ اس جرگے سے مخاطب ہو کر یوں جواب دیتا ہے:

''عبدالرحمان بگٹی لہو میں لتھڑا ہوا ہے۔ میری قوم کے ساتھ انگریزوں نے بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ بلوچ قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے بکریوں کی طرح قوم کو دھتکار کر لتاڑا گیا۔ بلوچ قوم کے اسلاف کی متعین کردہ راہوں کو اجاڑا گیا۔ قوم کے بچے بچے کی زبان پر

بلوچستان کی آزادی کا نعرہ ہے۔ میں اس ننگ دھڑنگ قوم کے وجود کا حصہ اور زخموں کا نوکر ہوں۔ مجھے اس دھرتی کے دکھ درد جھیلنے کی نوکری ملی ہے۔ خدا کے لیے اس دھرتی کے وجود کو ضائع نہ کرو۔ بگٹی قبیلے کی سربراہی تو کیا اگر مجھے پورے ہندوستان کی بادشاہت دی جائے، تب بھی قوم کے حقوق سے منہ نہ موڑوں گا''۔(2)

جرگہ نے سردار زادہ کے اِس بیان کو ایک لا ابالی نوجوان کی نادانی سے تعبیر کیا۔ اس لیے، پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ یہ سزا یافتہ آزادی پسند نوجوان جلاوطن ہو گیا۔ اور ولی عہدی کو خیر باد کہتے ہوئے پہلے نوشکی گیا، وہاں سے قندھار، اور پھر واپس کوئٹہ آ کر قیام پذیر ہو گیا۔ انگریز' ہر سامراج کی طرح اپنے غلام ملک میں ایک لفظ کے اندر تو اپنی موت دیکھتا تھا: آزادی۔ اور میر عبدالرحمان نے اسی لفظ کی تکرار کو زندگی بنا لیا۔ چناں چہ حاکم انگریز اپنے مفادات کے ہاتھوں مجبور' اور عبدالرحمان اپنی قومی بقا پہ معمور' اپنی اپنی ڈیوٹی کرنے لگے۔ انگریز نے اسے نظر بند کر دیا۔ جسمانی اور ذہنی تکالیف دیں۔ یہ اُن کی ڈیوٹی تھی۔ اُدھر میر صاحب رجعتی فضا کو ٹھوکروں پر رکھ کر ترقی پسندانہ سوچ پھیلانے والا' اپنا فرض ادا کرتا رہا۔ دونوں طرف پشیمانی نہ تھی، تھکاوٹ نہ تھی۔

جیسا کہ ذکر ہوا میر عبدالرحمٰن اپنی تحریک میں اکیلا نہ تھا۔ اُس کے اپنے قبیلے میں بہت سے لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور مصیبتیں جھیلیں۔ ممتاز دانش ور عزیز بگٹی کا دادا میر نور محمد خان اس بغاوت میں شامل تھا۔ اسی وجہ سے وہ سرداری عتاب کا شکار بھی ہوا اور انگریزی جبر کا بھی۔ اُس کی زندگی کے آخری پانچ سال قید و بند میں گزرے۔ پہلے نواب محراب خان بگٹی کے تحت ڈیرہ بگٹی اور سنگسیلا کے قید خانوں میں اور پھر انگریز سرکار کے تحت حیدر آباد اور سبی میں۔ انھی جیلوں میں اُسے کتابوں کی رفاقت ملی اور یہیں وہ یوسف عزیز مگسی اور صمد خان اچکزئی کی فکر سے آشنا ہوا۔ یہیں جیل میں تو اسے زہر دے کر مار دیا گیا۔(3)

کوئٹہ میں میر عبدالرحمان بگٹی کو شہری ماحول میسر آیا۔ اور وہ باقاعدہ انجمن اتحادِ بلوچاں کے ساتھ مل کر اس کے فکر اور مشن کو آگے بڑھانے میں جُت گیا۔ اُس زمانے میں تحریکی لوگوں کو لکھنے اور اخبارات کے ذریعے لوگوں کو ہم خیال بنانے کا زبردست ادراک ہو چکا تھا۔

میر عبدالرحمان نے بھی سندھ و ہند میں جو بھی جرائد و اخبارات کا پتہ چلا، ان میں مضامین لکھ کر بھیجے۔ یہ مضامین انگریزوں کے مظالم اور عوامی حقوق کے بارے میں ہوا کرتے تھا۔ اس کام میں سُرخیل تو یوسف علی عزیز خود تھا۔ نیز مگسی صاحب اپنی شاعری کی وجہ سے بھی لوگوں میں ہر دل عزیز تھا۔

خود عبدالرحمان بھی شاعری کرتا تھا۔ اُس کا تخلص آزاد تھا۔ بلوچ اور بلوچستان سے بے انتہا محبت اور انگریز سامراج سے نفرت بھری شاعری ہوتی تھی اور یہی کچھ اُس کے مضامین کے موضوعات ہوا کرتے تھے۔

اِن لوگوں نے ایک اور ہتھیار کو بھی مؤثر انداز میں استعمال کیا: وہ ہے، خط لکھنا۔ کاش اس دور کے بلوچ اکابرین کے خطوط مل جاتے اور اُن کو یک جا کر کے شائع کیا جاسکتا تو بلوچ تاریخ کی گم کڑیاں خوب صورتی سے مل جاتیں۔ بگٹی صاحب کے دو خطوط تو میں نے مرحوم کمال دین شیرانی کے پاس دیکھے تھے، لیکن کہتے ہیں کہ دوسرے احباب کو بھی اس نے بہت سے خطوط لکھے تھے۔ بالخصوص اپنے والد کو بے شمار خطوط لکھے، جو سیاسی نوعیت کے تھے۔ وہ آخر تک کوشش کرتا رہا کہ نواب محراب خان انگریز کی چالوں سے باخبر اور خبردار ہوجائے۔ وہ نواب صاحب کو سامراج نوازی کے بجائے سامراج دشمنی کے راستے پر لے جانا چاہتا تھا تاکہ اُس کے توسط سے پورا بگٹی قبیلہ سامراجی آلہ کار بننے کی بجائے آزادیِ وطن کا کام کرے۔

مگر اُس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ اس کا والد اپنی نوابی میں مگن انگریز کے ہاتھوں مجبورِ محض تھا۔ نوابی کی داخلی لوازمات اور انگریز کے دباؤ کے سبب عوام الناس ظلم و زور آوری کی چکی میں پس رہے تھے۔ تب میر عبدالرحمٰن نے اپنے والد محراب خان کے خلاف ''محراب گردی'' لکھا۔ یہ ایک پمفلٹ تھا جو ''شمس گردی'' کے قافیے میں لکھا گیا۔ انقلابی بیٹا، نواب باپ کے خلاف پمفلٹ چھاپے اور بانٹے!! ہمیں ایسی کوئی اور مثال ڈھونڈنے سے شاید ملے، پوری دنیا میں۔

اس تحریر میں اِس بڑے انقلابی نے اپنے قبیلے بگٹی کی حالتِ زار کی تفصیل بیان کردی، سرداری کے نقصانات جتائے، بلوچ قومی تحریک منظّم کرنے کی ضرورت و افادیت بیان کی،

بلوچستان سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کا عزم ظاہر کیا، اور اس میں سرداری نظام کے خاتمے کا مطالبہ شامل تھا۔ علاوہ ازیں میر عبدالرحمان بگٹی نے قلات کے وزیراعظم شمس شاہ کی برطرفی کا مطالبہ کیا، بلوچستان میں تعلیم عام کرنے کی بات کی اور انجمن اتحادِ بلوچستان کی حمایت اور طرف داری کا اعلان کیا۔

میر عبدالرحمان بگٹی اور اُن کے رفقا کا شعور کس قدر بلند تھا اور وہ کس قدر عمدہ فلاسفر تھے، ہم صرف اُن کا ایک فقرہ نقل کرتے ہیں:

''غلامی کو کسی نے شوقیہ گلے نہیں لگایا۔ غلامی نے تو جبر کے نطفے اور کمزوری کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جس میں رضا کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوتا''۔

اقوالِ زریں کے مالک تھے ہمارے پیش رو!!

25 صفحات پر مشتمل یہ پمفلٹ 1933ء کو جیکب آباد میں شائع ہوا' اور مفت تقسیم ہوا۔

ظاہر ہے اس پمفلٹ کا وہی حشر ہوا جو اس طرح کے پمفلٹوں کا مقدر ہوا کرتا ہے۔ اس کے پڑھنے اور تقسیم کرنے پر سرکار نے پابندی لگادی۔

بگٹی صاحب نے دوسرا داؤ پیچ استعمال کیا اور اِس فعل پہ یوں نظم لکھی:

واث گوئی مقدر سے بلوچی قوم میں
کاٹ دینے کے جو قابل ہیں وہ سر پیدا ہوئے
حق سے ہو لڑائی روز و شب صبح و شام
اور باطل کو بچائیں، وہ سر پیدا ہوئے
خوف دل سے سمجھتے ہوں باطل کو خدا
اور جلائیں گشت ِ حق کو وہ شرر پیدا ہوئے
کشتی انصاف چھوڑیں بحریاں میں
ظلم کو ساحل لگائیں، وہ خضر پیدا ہوئے

روشنی قربان ہو جن کی فقط فرمان پر
ظلمتِ افزا میں شمس و قمر پیدا ہوئے
اپنے آبنائے وطن کو تو نصیب آزاد ہو
ظالموں کے واسطے یہ خشک و تر پیدا ہوئے

یہ زمانہ کوئی عام زمانہ نہ تھا۔ یہ جبر وستم کا ایسا دورانیہ تھا جہاں شمس شاہ، ظلم کا مقامی دیوتا' اور سامراجی شیطان، باہم مل چکے تھے۔مگر جہاں بلوچوں کی منظّم مزاحمت کی حامل تنظیم ابھی ابھی ابھر رہی تھی۔ یہ دور بے کسی اور بے بسی کا دور تھا۔ ریاست اپنے شہریوں پر ماقبل تاریخ کے زمانے کا جبر روا رکھے ہوئے تھی۔لب کشائی اگر منظّم نہ ہو تو ریاستی جبر' محکومی کی نفسیات مسلط کر دیتا ہے۔ ریاست نے شمس شاہ کو جبر کے تخت پر بٹھا رکھا تھا اور قبائلی سرداروں کو اِس تخت کے ستون وسہاروں کی حیثیت دے رکھی تھی۔ لیویز رسالدار سردار کے لاٹھی تھے اور لیویز فورس جبر کے فوری اور حتمی نافذ کنندگان۔امن وامان کا مطلب ریاستی جبر کا خاموشی سے سہنا تھا۔(آج بھی ایسا ہی ہے!)۔

انجمن اتحادِ بلوچاں ابھی کونپل ہی تھی۔عوامی مقبولیت پانے کی ہر خاصیت اس کے اندر موجود تھی۔مگر ریاست خواہ کتنی ہی ابتدائی شکل میں ہو، ہمیشہ چوکنا رہتی ہے۔اس نے ہر طریقے سے کوشش کی کہ نجاتِ آدم اور آزادیِ وطن کے تصورات مبہم ہی رہیں۔ چنانچہ آزادی کے نقارچی عوام سے دُور جلا وطن کر دیے گئے۔.........مگر'یہی استبدادی ریاست کی موت بھی تو تھی۔بکھرے ہوئے رہنما جلا وطنی میں اکٹھے ہوئے تو تنظیم بنی۔عوامی تنظیم تو شیطان کے لیے لگام ہوتی ہے۔ شمس گردی، محراب گردی، جیکب آباد بلوچ کانفرنس، حیدرآباد بلوچ کانفرنس......ارے برطانیہ مارا گیا،شمس شاہ مارا گیا، سرداری نظام مارا گیا۔

مگر 1935ء کا زلزلہ جسمانی تباہی جو لایا سو لایا، اس نے تو بلوچ کی نوخیز سامراج دشمن تنظیم کو اکھیڑ پھینک دیا۔زلزلہ دشمن کہ اس نے یوسف عزیز کو مار دیا۔کینسر ہمارا دشمن کہ اس نے بزنجو، گل خان ، یوسف زئی اور عنقا کو مار دیا...... اور ضرورت کی گھڑی پہ مار دیا۔ چنانچہ جھنڈا تھام لیا عبدالرحمٰن نے، عبدالعزیز نے، محمد حسین نے، عبدالصمد نے...........تم سب کے بازوؤں کو سلام!!۔

یارانِ یوسف نے اس قومی سانحے کا بڑا آبرومندانہ مقابلہ کیا۔ جو شاعر تھا اُس نے سب کام چھوڑ، قومی شاعری پہ زور لگایا۔ جو مضمون نگار تھا اس نے ہندوستان کے اخبارات بھرنے شروع کر دیے۔ یوسف عزیز کی کمی تو ایسے ہی پوری کی جاسکتی تھی۔ وہ تو ایک میں دس تھا۔ مگر اس کے ساتھی اس کے کاز سے ایسے وفادار نکلے کہ اپنی للکار سے، دلیل سے، اپیل سے ہندوستان بھر میں ایک تہلکہ مچا گئے۔ ایک ہی سال میں اس قابل بنے کہ انجمن کے بجائے دو سالم اور بھرپور سیاسی پارٹیاں کھڑی کر دیں۔ میر عبدالرحمان نے جس پارٹی کی تشکیل میں پسینہ بہایا اس کا نام ''انجمنِ وطن'' تھا۔ جلاوطنوں نے یہ پارٹی مگسی صاحب کے انتقال کے ایک سال کے اندر اندر 1936ء میں کھڑی کر دی، کراچی میں۔

انجمن کے یہ لیڈر جب کوئٹہ آئے تو لوگوں کے جمِ غفیر نے اُن کا استقبال کیا۔ اس قدر مقبولیت دیکھی تو انگریز پھر خوف زدہ ہوئے۔ (ظالم کی نشانی یہ ہے کہ وہ خوف زدہ جلدی ہو جاتا ہے)۔ اور سرکار جب سیاست سے خوف زدہ ہوتی ہے تو سیاست پر، سیاسی پارٹی پر پابندی لگاتی ہے، کاغذوں مسودوں پر قبضہ کرتی ہے، دفتروں کو سیل کر دیتی ہے اور راہنماؤں کو جیل میں ڈالتی ہے۔ چنانچہ اب کے میر عبدالرحمان بگٹی بغاوت کے جرم میں پکڑا گیا۔ بگٹی قبیلے کی سرداری اور آسائشوں کو ٹھکرانے' اور بلوچ قوم کی آزادی کے خواب بیچنے والا عبدالرحمٰن بغاوت کے جرم میں جیل ڈال دیا جاتا ہے۔ ایسے راہنما کو جس کے ''انجمنِ وطن'' کے کنونشن میں آٹھ ہزار افراد شریک ہوتے تھے۔ اور وہ بھی کوئٹہ جیسے شہر میں۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ کوئٹہ میں داخل ہونے والے ایک ایک شخص کی تفتیش کے بعد شہر میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔

ہمارا یہ سامراج دشمن' سردار مخالف' آزادی پسند بلوچ بے وطنیوں، مالی تنگ دستیوں اور ذہنی کرب و تکالیف جھیلتے جھیلتے رانچی (انڈیا) میں جیلیں بھگتتے بھگتے، یکم ستمبر 1949ء کو جیکب آباد میں انتقال کر گیا۔ اس کی بجائے اس کا چھوٹا بھائی محمد اکبر خان بگٹی قبیلہ کا سردار تھا۔(4)

حوالہ جات

1- مگسی، دھڑیں بخش خان۔ نواب زادہ میر عبدالرحمان بگٹی۔ سنگت کوئٹہ۔ ستمبر 2004۔ صفحہ 45۔48

2- بگٹی، عزیز۔ بگٹی قبیلہ۔ 2005 قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 34

3- بگٹی، عزیز۔ ترقی پسندی سراب۔ ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی۔ دسمبر 2008۔

4- کوثر۔ انعام الحق۔ بلوچستان میں اردو۔ 1994۔ مقتدرہ قومی زبان۔ صفحہ 514

ماسٹر نسیم تلوی

نسیم صاحب سبی کے نواحی گاؤں تلی کا رہائشی تھا، اس لیے ''تلوی'' بنا۔ نسیم بھی اس کا اپنا نام نہ تھا بلکہ اس کا اصل نام تو پیر بخش تھا۔ اس نے 1933ء میں میٹرک پاس کر لیا اور ٹیچر بن گیا۔ اس لیے اس کے نام کے ساتھ اُس زمانے میں ماسٹر لکھا اور بولا جاتا تھا۔ بعد میں آزادیِ وطن کی ہم نوائی کی اور قومی آزادی کی تحریک کے بابا، یوسف عزیز مگسی کی ہدایت پر کراچی پہنچ کر صحافت کو اپنا لیا۔ تلوی صاحب نے ایک مرتبہ دہلی جا کر وہاں سے ''ینگ بلوچستان'' جاری کیا لیکن وہ دوسری بار شائع نہ ہو سکا۔ واپس آ کر کراچی سے ''بلوچستان جدید'' جاری کیا۔ اسی پریس سے تو سندھ کے مشہور کمیونسٹ راہنما حشو کیول رامانڑیں نے انگریز کے خلاف وہ مشہور پوسٹر شائع کیا تھا، جس میں ہندوستان کے نقشے پر ایک فوجی کی تصویر میں اس کے دو ''لانگ بُوٹ'' بھی دکھائے گئے اور اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Stop this march of Imperialism.

پیر علی محمد راشدی نے ایک جگہ لکھا: نسیم تلوی مرحوم لیاری محلے کے بلوچ اور پیدائشی پہلوان تھے۔ سدا جوان، سدا بہار؛ آخر تک چہرے سے عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سیاست کے ڈنگ کا شکار تھے۔ صحافت کا پیشہ اختیار کیا مگر اسے پیشے کے طور پر استعمال نہ کیا۔ اخبار کا نام تھا: ''بلوچستان جدید''۔ آزادی کے عاشق تھے اور عزتِ نفس کے بغیر جینے کو جنجال سمجھتے تھے۔

غریب تھے مگر غیرت مند۔ سندھ اور بلوچستان کی آزادی اور سربلندی کے راستے میں جو کوئی حائل ہوتا اسے میدان سے بھگانے کی کوشش کرتے۔

انہوں نے اپنی سیاست اور صحافت دونوں کو بلوچیت کے سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ بلوچستان اور سندھ کا ہر دشمن اُن کا ذاتی دشمن تھا: اور دشمن کا دروازہ تکنا، اُس سے ہنس کر ملنا، اس کا نمک کھانا حرام۔ اس کا احسان اٹھانا، مثلاً رہائشی پلاٹ لینا، رعایتی سفر کی سہولتیں لینا، کاغذ کے پرمٹ پانا، اُس کے خرچ پر بیرونی ملکوں کی سیر کرنا بالکل گویا لحمِ خنزیر۔ یہاں تک کہ اخبار کے لیے حکومت کے اشتہارات کبھی قبول نہ کرتے۔ گرہ میں پیسے ہوتے تو پرچہ نکلتا ورنہ ناغہ۔ مگر ناغے کے بعد جب پرچہ آتا تو جیسے موالیوں کے سامنے دوآتشہ آ گئی ہو۔ آگے پیچھے کی سب کسر نکل جاتی۔ اگلے شمارے تک موزیوں کے گھروں میں کہرام مچا رہتا۔

نسیم تلوی مرحوم قلم رانی کے علاوہ دوسرے فن بھی جانتے تھے مثلاً خردم چلانا اور ٹکر مارنا۔ ہاتھ میں قلم، کمر میں خردم، آدمی پر کیا پتہ کب وارد ہوجائے، اس لیے پیشگی دفاعی بندوبست رکھتے تھے۔ ٹکر مارنے کا مطلب تھا: سر سے سر ٹکرا کر مخالف کی پیشانی کی ہڈی توڑ دینا، ورنہ کم ازکم ماتھے کی کھال کو پھاڑ کر لہولہان کر دینا۔ جاپان کے جوڈو کراٹے کا یہ سندھی بلوچی نعم البدل تھا۔

تقسیم سے پہلے ان کی تمنا تھی کہ موقع ملے تو ''سندھ آبزرور'' کے متعصب مہا سبھائی ایڈیٹر آنجہانی کو ٹمراج پُنیا کا سر پھاڑ دیں.........تقسیم کے بعد نسیم کے ذہن پر ایک نو وارد دوسرے ایڈیٹر کی صورت مسلط ہوگیا۔ یہ صاحب مسلمان تھے۔ نسیم کا خیال تھا کہ وہ سندھ اور سندھیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے خلاف ہیں..........''۔

(راشدی، پیر علی محمد/اجمل کمال۔ وہ دن وہ لوگ۔ کراچی کی کہانی۔ آج۔ خزاں 1995)

نسیم تلوی نے 1958ء میں کوئٹہ سے اخبار ''بلوچستان جدید'' جاری کیا۔ یہ اخبار روزنامہ تھا اور خوب چل نکلا۔ ایک ہی سال گزرا تھا کہ بلوچستان کے صحافی مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے۔ نسیم بھی ہمراہ تھا۔ واپس پر لاہور میں حرکتِ قلب بند ہونے سے اس کا انتقال ہوگیا۔

ذرا انقلاب دیکھ

نسیم تلویؔ

آتا ہوا جہاں میں تو انقلاب دیکھ
سردار ڈر رہے ہیں، ذرا اضطراب دیکھ

تو نے بہت سی دیکھی ہیں تبدیلیاں مگر
بدلا ہے کس طرح سے زمانہ شتاب دیکھ

جرگہ کے قصر ظلم میں آیا ہے زلزلہ
اس کشمکش کو دیکھ، ثواب و عذاب دیکھ

مظلوم کی ہے آہ، جو پہنچی ہے عرش پر
ظلمت کے اس افق پہ ذرا ماہتاب دیکھ

بڑھنے لگی ہیں غیر کی اب مہربانیاں
بدلے ہیں طور کس لیے عفو و عتاب دیکھ

عہد کہن کی یاد سے کیوں تلخ کام ہے
آنے لگا ہے دور نیا آب و تاب دیکھ

کہتے ہیں سازشی ہمیں مطلب پرست سب
پر اصلیت کا اٹھ کے رہے گا نقاب دیکھ

ہونے لگی شکست ہے باطل کو اے نسیم
آتا ہے انقلاب، ذرا انقلاب دیکھ

محمد اسلم اچکزئی

اسلم جان کے نام سے مشہور محمد اسلم اچکزئی 1915ء میں عنایت اللہ کاریز میں ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 17 برس کی عمر میں 1932ء میں آزادی کی تحریک میں شامل ہوئے۔حکومت نے ایک غلط مقدمے میں پھنسایا اوراپنے آبائی ضلع سے خارج کردیا۔آپ کچھ عرصہ تک ''مچ'' میں رہے۔وہاں سے بھی جلاوطن ہوئے۔اِسی خانماں بربادی کے دوران انہیں بلوچستان کے چند نوجوان سیاسی کارکنوں کی صحبت نصیب ہوئی۔وہ ان کے کردار وعمل اور افکار و خیالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود بہت مہذب سیاسی کارکن بن گئے۔ان کا قلب وضمیر انسان دوستی اور حب الوطنی کے مقدس جذبات سے منور ہوگیا۔اچکزئی صاحب کانگریس میں شامل ہوگئے (1)۔

وہ جیکب آباد کے مشہور اور تاریخی اخبار ''الحنیف'' کے ایڈیٹر بنے۔وہ وہیں جیکب آباد میں رہے۔اور پھر'جیکب آباد ہی سے اپنا اخبار'' کمال ہند' جاری کیا جس نے بلوچستان اور سندھ کی صحافت میں ایک نمایاں مقام پایا۔اسلم جان کی تعلیم واجبی سی تھی لیکن وہ بہت عمدہ اردو لکھتے تھے۔یہ اخبار بلوچستان کے بارے میں پر جوش اور بہادری سے لکھتا تھا۔ایڈیٹر اسلم ناانصافی اور سامراجیت کے خلاف صف آرا تھے۔ان مقاصد کے باعث آپ ہمیشہ ہنگاموں اور تکالیف سے دو چار رہے۔یہ اخبار انہی ہنگاموں، بھاری جرمانوں،ضمانتوں اور ہر جگہ داخلے کی پابندیوں کے سبب

بند ہوگیا۔مگر'اس کے بند ہوتے ہی اسلم اچکزئی نے''نوجوان'' کے نام سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔یہ اخبار ابھی تک جاری تھا کہ مالی بحران کا شکار ہوگیا۔جیکب آباد کی بلدیہ، انتظامیہ اور وڈیرہ شاہی''نوجوان'' کی بے باک نویسی پر جلے بھنے بیٹھے تھے۔شہر بازار کے قرضوں کے علاوہ پریس اور دفتر کے کرایہ کی کافی رقم واجب الادا ہوچکی تھی۔مخالفین کی ملی بھگت سے عمارت کے مالک نے عدالت کے ذریعہ ڈگری لے کر پریس اور دفتر کو مقفل کرادیا۔دوسری طرف ان کے اپنے وارنٹ جاری ہوچکے تھے۔چنانچہ وہ وہاں سے چھپ گئے اور فرار ہوکر سبی میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ جہاں وہ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے جلاوطن دوستوں کی صحبت میں رہنے لگے۔شدید غربت سب پر طاری تھی۔سب کا مشترک قرض چلتا تھا اور جس کے پاس رقم ہاتھ آتی،مشترکہ قرضہ چک جاتا۔ لیکن اسلم سب سے بڑے قربانی والے نکلے۔انہوں نے ہرنائی کی اپنی بیچ ڈالی اور قرضہ ادا کیا۔ جسے انہوں نے بڑے ارمان سے''باپ دادا کی ہڈیاں بیچنے'' کا عمل قرار دیا تھا۔(2) وہ کہا کرتے:

''آزادی کے لیے جائیداد کی قربانی مہنگا سودا نہیں ہے''۔(3)

اپنی جائیداد بیچ کر ہی 1942ء میں وہ دوبارہ جیکب آباد گئے اور اپنا اخبار''نوجوان'' جاری کیا۔یہ سامراج دشمن، وطن دوست اور جاگیردار مخالف اخبار تھا۔وہ سوشلزم چاہتے تھے۔چھ ماہ تک ان کے اِس اخبار''نوجوان'' کا دوسرا جنم چلا۔

جناب محمد اسلم اچکزئی 1942ء میں Quit India نامی قومی نعرے کے تحت گرفتار ہوئے اور سکھر جیل میں قید وبند کی صعوبتوں میں رہے۔یہیں انہیں ٹی بی ہوگئی۔وہ سخت بیمار ہوئے، اس موذی مرض کا اُس زمانے میں سوائے موت کے کوئی اور علاج نہ تھا۔سرکار انہیں رہا کرنا چاہتی تھی مگر اِس شرط پر کہ وہ اپنی بقیہ رہی سہی زندگانی میں قومی آزادی کا کام نہیں کریں گے۔چنانچہ انہیں باضابطہ پیشکش کردی گئی کہ وہ ایسا لکھ کردیں تو انہیں رہا کردیا جائے گا۔لیکن ذرا سوچیے،اگر وہ لکھ کر دیتے تو آج کوئی مصنف انہیں اپنے مشاہیر میں جگہ دے کر اُن کی سوانح حیات لکھتا؟۔ ہمارے اِس اکابر نے اس پیشکش کو ٹھکرادیا اور اپنوں سے دور جیل کی سیاہ کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کو ترجیح دی۔محترم محمد اسلم اچکزئی 1944ء میں اس وقت رہا کردیے گئے، جب ڈیڑھ

سال بعد دوسرے قیدی بھی رہا ہوگئے اور جب ان کی صحت کا دیوالیہ نکل چکا تھا اور وہ ہڈیوں کا پنجرہ بن چکے تھے۔ اچکزئی صاحب ٹی بی سینٹوریم میں 31 برس کی عمر میں وفات پا گئے۔(4) اس یادگار انسان کا مرقد گلستان میں ہے۔

آزادی کا یہ سپاہی لاکھوں دیگر معلوم و نامعلوم سپاہیوں کی طرح انگریز سے زندگی بھر لڑتا رہا۔ غالب کا یہ شیدائی(5) زبردست قلم چلاتا تھا، ساتھ میں اخباری مشین بھی خود چلاتا تھا۔ علاقہ بدر ہوا تو دوسرے علاقے میں وہاں کے لوگوں، دوسری زبان بولنے والے لوگوں کے دل تو جیت لیتا ہے مگر اپنے پیارے بچوں، غم گسار بہنوں، براہندغ بھائیوں اور محبوب دوستوں کی جدائی کے زخم سہتے سہتے اسلم مرگیا۔

جیکب آباد میں ''اسلم شہید لائبریری'' تو اُن کے نام پہ بنائی گئی تھی مگر بلوچستان میں کون کسے پوچھے۔ ہم سب عقل کے ڈیڑھ خان ہیں۔ اسلم لائبریری جیکب آباد میں اور قاضی داد محمد لائبریری سبی میں اختتام کے خطرے میں ہیں، کتابوں کی نایابی، وزیٹرز کی کمی......اور ناآشنائی کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ہم وثوق سے کہتے ہیں کہ اگر اسلم بھول گیا تو سمجھو بلوچستان بھول گیا، قاضی داد محمد بھول گیا تو جانو مشن بھول گیا۔ آزادی کے اِس گم نام سپاہی کی قدر و قیمت اگر ہم مست لوگوں کو نہیں، تو کم از کم اُن کے ہم عصر مشہور شدہ احباب کی تحریروں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ گل خان نصیؔر ان کی موت کو اپنا ''کلیجا چاک'' ہو جانا قرار دیتے ہیں:

یہی دو چار تنکے تھے ہمارے آشیانے کے
کہ ان کو بھی بہا کر لے گئے طغیاں زمانے کے
گرا کر بجلیاں دست قضا نے خاک کر ڈالا
کہ اسلم کی جدائی نے کلیجا چاک کر ڈالا

حوالہ جات

1۔ ملک پناہ۔ اسلم خان اچکزئی۔ 2004۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ۔ صفحہ 9

2۔ صفحہ 10

3۔ ایضاً

4۔ اچکزئی صمد خان......زما ژوند اوژوندون۔ صفحہ 21

5۔ اچکزئی نسیم۔ پتھر سے موم تک۔ سنگت

عالی جاہ، ملک فیض محمد یوسف زئی

دوست کہتا ہے کہ وہ جب بھی میں ملک فیض محمد یوسف زئی کو دیکھتا، تو مجھے جاپانی بدّھا کا گمان ہوتا تھا۔ جاپانی بدّھا اور اصلی بدّھا میں کیا مماثلت ہے اور کیا مشترکہ اقدار ہیں، یہ ایک الگ بحث ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ مہاتما بدھ (اصلی والا) بہت بڑا انسان تھا۔ بدھ کی تعلیمات اُس زمانے میں مقبول تھیں جب پورے برصغیر میں غلام داری کا سماج قائم تھا۔ اس لیے مہاتما بدھ سے زیادہ واقفیت نہ ہوتے ہوئے بھی بلوچوں کو بدھ ازم ''اپنا اپنا'' سا لگتا ہے۔ ہماری اپنی موجودہ نسل پر اُس کے زبردست اثرات ہیں۔ اس لیے بھی کہ ہمارے بزرگ دانش وروں پہ مہاتما بدھ کی شخصیت کا جادو مکمل طور پر چھایا رہا۔ پھر، اس میں کچھ ہاتھ ول ڈورانٹ کی کتاب Our Oriental Heritage کا بھی ہے جو کہیں نہ کہیں' اور کبھی نہ کبھی ہمارے دانش وروں میں گردش میں رہتی ہے۔ پھر کہیں سے ''لائٹ آف ایشیا'' نامی کتاب آئی اور بعد میں جواہر لال نہرو کی تصانیف یکے بعد دیگرے ذہنوں پہ بمباری کرتی رہیں۔ ہمارے سماج کے اندر یہیں کہیں مہاتما بدھ موجود تھا۔ جس طرح میڈیکل کے سٹوڈنٹس کسی بیماری کے بارے میں پہلی بار پڑھ کر خود کو اُسی بیماری کا شکار سمجھنے لگتے ہیں، اسی طرح انسان مہاتما بدھ کے بارے میں پڑھتے ہوئے خود کو غیر معینہ مدت کی بھوک ہڑتال والے درخت کے نیچے محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہر پڑھے لکھے شخص کی زندگی کی کم از کم ایک پوری شش ماہی مہاتما جی کے نام ہوتی ہی ہے۔ ویسے بھی جب سیاست نہ ہو رہی ہو، کوئی بڑی سماجی تحریک نہ چل رہی ہو، آس پاس انسپائر کرنے والی حکومت دہائیاں بیتیں بکھر چکی

ہو، کوئی بہت ہی بڑا نظریہ دان موجود نہ ہو تو کوئی نہ کوئی مہاتما اس خلا کو آن بھر جاتا ہے۔ یہ درویشوں والی راہ اپنانے کی خواہش کہیں نہ کہیں ہماری آپ کی جینز میں موجود ہوتی ہے۔ ہم اچھے بھلے انسان کو بھنگ (فکری نہیں) کے جام کے حوالے کر کے اس کی میل کچیل کی پوجا کرنے میں ایک لحاظ سے سکون محسوس کرتے ہیں۔ سیاسی پراسیس کی چکی میں ہماری قبائلی اور فیوڈل انا پس نہیں رہی تو بزرگ ہی ہم پہ دم کے نام سے تھوک لے، کوئی نیچ نام رکھ دے، تین بار پیٹھ پہ (یا چاہے تو سر پہ) تھپڑ مارے۔

اچھا، یہ شاید ہمارے بھاگوں میں نہیں تھا کہ سیاسی جدوجہد کرنے میں استقلال رکھنے والوں کی ایک پوری کھیپ کی بلوچستان میں موجودگی کو اپنا مشعلِ راہ بنا پاتے۔ معلوم نہیں یہ لوگ کیوں ہمارے لیے Source of inspiration نہ بن سکے۔ شاید یہاں کا دانش ور انہیں اس طرح پیش نہ کر سکا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ملک فیض محمد یوسف زئی بہت بلند انسان تھا۔ وہ مظالم کے خلاف روزہ رکھنے کی بجائے جلا وطنی، جیل اور لاٹھی چارج کے حوالے ہو گیا۔ ایک ایسے معاشی سیاسی اور سماجی پس منظر میں کہ جہاں معاشی کرپشن عروج پر ہو، وزیر بھی کھا رہا ہو، مشیر بھی' اور سیکرٹری بھی۔ جہاں، ایم این اے، ایم پی اے اور سینیٹر پیسہ جمع کرنے کی تحریک کی قیادت کر رہے ہوں' جہاں ٹریڈ یونینسٹ، سٹوڈنٹ لیڈر، حزبِ اقتدار، حزبِ اختلاف، پیر فقیر، ملا مولوی، ڈاکٹر وکیل، مدرس ممتحن سب کے سب اپنے اپنے دائرہ اثر میں اپنی اپنی بساط کے مطابق ''رزقِ حلال'' کے حصول کی ''عین عبادت'' میں کل وقتی طور پر تن من دھن کی بازی لگائے بیٹھے ہوں، جہاں ہر قول کی پکائی اور ہر بات کی سچائی کی جانچ پڑتال رشوت، کمیشن تک محدود ہو کر رہ گئی ہو۔ جہاں مہمان نوازی، روایت، ثقافت، غیرت سب کچھ نیلے نوٹوں پر نچھاور ہو رہی ہوں، پجیرو، جھنڈا، بنگلہ گاڑی، باڈی گارڈ، غنڈوں کا جھرمٹ' شراب و عذاب، جی حضوریوں کی ٹولی۔ ساری کائنات سمٹ کر ''اشیا'' میں سما چکی ہو، جہاں ہر بڑا شخص ماتھے پر چھ آٹھ انسانوں کے قتل کی تحریر لیے قبائلی جنگوں کے بھڑکانے اور دوام دینے کا موجب بنا ہوا ہو، اور جہاں اس حالت کو نارمل حالت گردانا جانے لگا ہو، وہاں پہ

ملک فیض سا ایک شخص مر جائے جو سیاست دان ہے ایمان والا، گھومتا ہے بغیر باڈی گارڈ کے، جس کے ضمیر میں کوئی خلش کوئی پشیمانی نہیں، سیاسی کام میں پیسہ کیا! رسوخ کیا!۔اصول کی خاطر ڈسپلن اور انسانی آزادی کی تمنا اُس کا اصول ۔ نام ونمود سے بے نیاز سادہ سی شخصیت، استقامت و استقلال میں بے مثال، نہ اکڑ نہ گھمنڈ، محبت واخلاص کا پیکر، ہر انسان کے بال بچوں کی خیریت کا طالب ،آپ کے علاقے میں امن اور بارش کا دعا گو،آپ کے وطن کی آبادی شادمانی کا خواہاں......ایسے انسان کی موت تو سارے جہاں، سارے عالم کا مرگ ہے۔ بلوچستان کی دھرتی کی علامت تھا وہ۔ بلوچستان مر گیا، بھیڑوں کی راجدھانی زندہ ہے۔اس مہان انسان نے مر کر ہمارے استحصالی سماج کے دانت ننگے کر دیے۔کھانے کے دانت، بے حجاب کھانے کے دانت!!!۔

ملک صاحب سے ملنے کے لیے آپ کو پڑنگ آباد جانا پڑتا۔ درمیان میں لک پاس کی بلندیاں آتی ہیں۔معلوم نہیں ان چڑھائیوں کو لک پاس کیوں کہا جاتا ہے ۔ بہر حال ہم جب بھی یاروں کے ہم راہ اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو کوئی نہ کوئی ساتھی بوجوہ یہ اعلان ضرور کرتا۔

Gentelmen! fasten your belts ....you have entered the area of Mastung اور کئی باہمت لوگ اس اعلان کے ردِعمل کے طور پر غیر ارادی انداز میں واقعتاً اپنے ہاتھ کمر تک لے جاتے، تب بے ساختہ اجتماعی بلند آہنگ قہقہہ گونجتا .... جی ڑے مستونگ جی۔تب ڈرائیور ٹیپ کی آواز بلند کرتا جہاں مراد بلوچ جھالاوانی گیت سنا رہا ہوتا؛

دیرایتک ،دیری آچشمہ، دیرایتک !!

مگر آج تو ہم ملک صاحب سے ملنے نہیں جا رہے تھے' آج تو اسے رخصت کرنے والا قافلہ تھا۔لہٰذا نہ تو مست قہقہے تھے،اور نہ بات چیت۔ٹیپ پہ صرف ملک صاحب مرحوم بول رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کے آخری انٹرویو کا ٹیپ تھا جو شہیک بلوچ، شاہ محمد مری اور ملک نور احمد نے ان سے لیا تھا۔لک پاس کے موڑوں میں ملک صاحب کی آواز گونج رہی تھی۔ یہ آواز بلوچستان کا مقدر بنی رہے گی۔ٹیپ پر ملک صاحب کی دھیمی آواز کے درمیان انٹرویو لینے والے کی غیر ضروری اور مضحکہ خیز'' ہوں' ہاں' ہاں آں'' کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔(معمر ہستیوں سے انٹرویو لینا بھی کس قدر

دشوار کام ہے۔آپ اگر'' ہوں ہاں'' نہ کرتے رہیں تو ان کی سوچ کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ یا تو جلد خاموش ہو جاتے ہیں یا موضوع سے ہٹ کر کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں)۔

رفیقوں کے لیے زندگی بھر ایثار اور قربانی کے اس پیکر سے جب ہم نے انٹرویو کے لیے وقت اور جگہ کا پوچھا تو کہنے لگا'' آپ پڑنگ آباد آئیں، یا مجھے بتائیں، دن کو کہیں، رات کو کہیں میں ضعیفی کے باوجود حاضر ہوں گا۔آپ جب بھی آئیں وہ جگہ (پڑنگ آباد) آپ کی اپنی ہے''۔ مردان کے ڈاکٹر جہاں زیب' اور لاڑکانہ کے ڈاکٹر کرتار ڈاوانڑیں کے بشمول بہت سے دوستوں کی پڑنگ آباد جا کر ملک صاحب سے ملاقات کی خواہش اب کبھی پوری نہیں ہو سکے گی ۔ پڑنگ آباد آج بھی ''اپنی'' جگہ ہے مگر سادہ لباس کندھے پر چادر رکھا وہ چھوٹے قد والا عظیم انسان محفل میں نہ ہو گا جو آخر تک کہتا رہا،'' ہمیں تو ایک دوسرے کو تلاش کرنا چاہیے۔اسی طرح آپ دوسرے ساتھیوں کو تلاش کریں، کم از کم اب' ہمیں' تو کچھ کام کرنا ہے۔ہم لوگوں نے تمام زندگی ایک مقصد کے حصول کے لیے صرف کی ہے۔دوبارہ کام شروع کرنے کے لیے ہمارا سب سے پہلا کام ہے کہ ساتھیوں کو تلاش کریں۔قحط الرجال ہے،ساتھیوں کی تلاش کریں''۔(بلوچ بڑھی آف آف کر کے مرگئی، پتہ نہیں آف اودی ماہئی ،اودا پیوھا''۔(بلوچ بوڑھی آف آف (پانی پانی) کہتی کہتی مرگئی، پتہ نہیں آف اس کی ماں تھی، اس کا باپ تھا؟!)۔

ہر زبان کی اصطلاحات کو سمجھنے کا اپنا ٹائم ، اپنا سپیس ہوتا ہے۔تحریکیں مرتی نہیں ہیں، اپنے انداز میں جاری رہتی ہیں۔ بہ ظاہر تو اُس وقت بھی ایسا تھا اور آج بھی ایسا ہے کہ بلوچستان میں آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر پکاریں'' ساتھی' ساتھی'' کوئی کان نہیں دھرے گا۔مگر آپ سات کمروں میں بند کھسر پسر سے کہہ دیں'' پیسہ'' تو بھگدڑ مچ جائے گی میروں کی اور کھچے چلے آئیں گے خزانے کی طرف ۔ ملک صاحب اور اُس کے ساتھیوں کی سیاست' ان کا نظریہ اور ان کا فلسفہ بہت ساری حقیقی وجوہات کی بنا پر آج زوال میں مبتلا ہے۔مگر رات بہر حال ایک صبح رکھتی ہے۔اور ہم تصور کر سکتے ہیں کہ جب عدم مساوات والے نظریے کی گھٹا ٹوپ رات کو مسرتوں والی صبح پچھاڑ دے گی تو کتنے موقع پرست آٹو میٹک طور پر ،اصلی انسانوں کو دھکیلتے دھکیلتے اس صبح کو کھینچ لانے

والوں کی اگلی صفوں میں جگہ پانے کے طالب ہوں گے۔مگر آج جب ملک فیض محمد یوسف زئی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں، ''مجھ سے کچھ مدد مل سکے بہ دو چشم، جو معلومات میرے پاس ہیں وہ بہ دو چشم'' تو سب لوگ سول سیکرٹریٹ میں ریوڑیوں کے بٹوارے میں مصروف ہیں۔خدا کرے بلوچستان کا ذکر داستانوں میں زندہ رہے۔

ملک صاحب کا مستونگ ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہوا کرتا تھا۔یہ وادی تعلیم اور تمدن کی بنیاد ہوا کرتی تھی۔خوانین قلات جب خطوط وغیرہ لکھا کرتے تھے تو وہ پڑنگ آباد نہیں لکھتے تھے، وہ لکھتے تھے: ''قندھارِ خورد''۔صرف پڑنگ آباد میں پچپن کاریزیں تھیں۔ایسی ایسی کاریزیں جن سے سترہ لاکھ پچپن ہزار پانچ سو بیرل پانی روزانہ ملتا تھا۔مستونگ کے بشمول پورے علاقے میں کل تین سو پینسٹھ کاریزیں تھیں۔یہاں کے لوگوں کو دال، گندم، آلو، وغیرہ گھر میں ملتا تھا۔ضرورت کی ساری چیزیں وہ خود پیدا کرتے تھے۔ایک سادہ سا طرزِ زندگی تھا۔لوگ با اخلاق، خوش مزاج اور مہمان نواز تھے۔رنگین طبع لوگ' موسیقی اور رقص کے دلدادہ تھے۔محض دوست پیدا کرنے کے لیے وہ لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے تھے۔اگر ایک اچھا آدمی ملے تو اس زمانے کے لوگ اُس سے محض تعلق استوار کرنے کراچی تک چلے جاتے۔اس ہنستے بستے مستونگ میں اب 365 میں سے محض دو کاریزیں باقی بچ گئی ہیں۔باقی سب سوکھ گئی ہیں۔پہلے 30,20 کاریزیں تو زلزلہ عظیم میں تباہ ہوگئیں۔باقی سرکار کی عدم منصوبہ بندی اور کرپشن کی وجہ سے سوکھ گئی ہیں کہ پیسہ صوبائی سیکرٹریٹ کے وسیع شکم میں گم ہوگیا۔مستونگ آہستہ آہستہ مرحوم حمید خان اچکزئی کے بقول، ''دھول اور ریت کا پیالہ بن جائے گا''۔

ملک صاحب کے آباؤ اجداد احمد زئی خاندان کے اقتدار سے پہلے مستونگ میں آباد تھے (بلوچستان پر احمد زئی خاندان نے سات ساڑھے سات سو سال سے حکومت کی)۔اس طرح مستونگ میں شاید ملک صاحب کا خاندان وہ واحد خاندان ہے جو یہ کہہ سکے کہ ان کی زمین سیکڑوں برسوں سے ان کی ملکیت ہے۔ورنہ بقیہ پوری آبادی سے اگر پوچھا جائے تو وہ یہ کہہ دے گی کہ ''یہ زمین میری ہے یا میرے باپ کی ہے'' اس سے آگے وہ نہیں جاتا۔ہمیشہ جواب ہوگا کہ فلاں سے

میں نے خریدی ہے۔بہر کیف' نئے دور نے مستونگ سے کاشت کاری چھین لی۔لوگ اپنا طرزِ زندگی بدل چکے ہیں اور سہل پرستی میں طویل عرصے تک کی تاریخ رکھنے والی کاشت کاری کو چھوڑ رہے ہیں۔حالاں کہ مشینی کاشتک کاری بہترین طور پر اپنائی جاسکتی ہے۔

ملک صاحب کے آباؤ اجداد زمینداری کے ساتھ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔کسی کے باغ کی فصل (یعنی آلو پیاز وغیرہ کی فصل) خرید لیتے اور پھر اسے فروخت کرنے پنجاب لے کر جاتے' یا سندھ کے شہروں میں بیچتے تھے۔اس طرح ان کی بہت آمدنی ہوتی تھی۔پھر ملک صاحب کے آباؤ اجداد قلات سرکار میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر متعین ہوا کرتے تھے۔ان کے لوگ آخر تک قلات دربار سے وابستہ تھے، بہترین عہدوں پر۔ان کے خاندان پہ فوجی ذمہ داریاں نہ تھیں بلکہ زیادہ تر سیاسی ذمہ داریاں تھیں، مثلاً خط و کتابت، میل جول، سرداروں کے پاس سرکاری امور کے سلسلے میں آنا جانا۔ان کے آباؤ اجداد قلات دربار میں لوگوں کو ان کے عہدوں کے مطابق کرسیاں الاٹ کرنے کے ذمہ دار تھے۔ملک صاحب بتاتے ہیں کہ مثلاً نصیر خان کا یہ دستور تھا کہ ہر قبیلہ، ہر ضلع مثلاً (مری، بگٹی، جھالاوان، خاران وغیرہ) سے متعلق شخص اپنے ڈریس میں آئے اور دربار میں بیٹھے۔خان خود آگے بیٹھتا تھا پھر شہزادے، پھر فوجی کمانڈر وغیرہ۔دربار کے دائیں طرف جھالاوان اور بائیں طرف سردارانِ ساروان مری، بگٹی وغیرہ بیٹھتے تھے۔

واضح رہے کہ قلات کی پوری فیوڈل ریاست میں خان کے دربار میں درباری امور کی انجام دہی چھوٹے مالکان اور اجارہ گر کے ذمہ تھی۔یہی سُنگ نامی ٹیکس وصول کرتے تھے، مکانوں کی مرمت کرواتے رہتے اور خان کے ان مہمانوں کا استقبال کرتے اور انہیں سہولتیں فراہم کرتے تھے جو کہ ریاست کے دیہی علاقوں میں سے گزرتے تھے۔چھوٹے کسان خان کے دربار میں عام نوکروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ان کی ڈیوٹیاں متعین تھیں اور وہ دائمی فرائض سرانجام دیتے تھے۔انہیں اس کام اور محنت کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔بلکہ وہ صرف مالیہ دینے سے معاف ہوجاتے تھے۔

مستونگ میں آباد دہواروں کے بارے میں ملک صاحب بلوچ تاریخ کے سوویت

سکالر پیکولین سے اختلاف رکھتا ہے۔ پیکولین صاحب کی تحقیق بتاتی ہے کہ دہوار تاجک ہیں۔ ماضی سے قلات کی ریاست میں زندگی بسر کرتے ہیں اور یہاں خان کی زمین اجارے پر لے کر کاشت کرتے ہیں۔ پیکولین کے مطابق 1951ء میں ان کی تعداد چار ہزار چار سو چونتیس تھی۔ 1931ء میں یہ لوگ پانچ ہزار تین سو سترہ کی تعداد میں تھے، جب کہ 1921ء میں ان کی تعداد چھ ہزار دو سو اڑسٹھ تھی۔ پیکولین بجا طور پر ان کی آبادی میں کمی کو ان کے اردگرد کے قبیلوں اور قومیتوں کے مابین ضم ہو جانے سے جوڑتے ہیں۔(1)

ملک صاحب کے خیال میں دہوار دراصل لفظ ''دیہہ دار'' سے بنا ہے، جس کا مطلب ہے: ''صاحبِ مکان، صاحبِ ملک و املاک''۔ باہر سے جتنے لوگ بھی آئے وہ سب دہوار کہلاتے ہیں۔ خواہ وہ کوئی بھی ہے مگر ان کی زندگیاں بلوچوں کے ساتھ گزرتی ہیں۔ غم و شادی میں شریک، رشتہ داریوں میں اس قدر بہتات کہ اندازہ نہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ زیست و موت میں برابر کے شریک چلے آرہے ہیں۔ دہواروں میں تاجک بھی ہیں۔ ملک سعید دہوار تاجک ہے اور اس کے حلقے تیری میں جو تین چار قومیں ہیں، وہ تاجک ہیں۔ ملک صاحب گو کہ پیکولین کی اس بات سے اتفاق نہیں رکھتا کہ دہوار رعیت اور ہمسایہ اجارہ گر کاشت کار تھے یا وہ خان کی زمین اجارے پر کاشت کرتے تھے حالاں کہ پیکولین ہیوز کے حوالے سے دہواروں کا خان قلات کی زمینوں پر اجارہ گروں کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔(2) مگر وہ یہ بات مانتا ہے کہ گو کہ دہوار اپنی زمیں داری اور زمین کے خود مالک تھے' البتہ وہ خان قلات کو مالیہ دیا کرتے تھے۔ خوانین قلات کا ان زمینوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دہوار آزاد تھے کہ خواہ اپنی زمین بیچتے، رہن رکھتے، اپنے پاس رکھتے یا کسی کو بخش دیتے۔ ملک صاحب تصدیق کرتا تھا کہ مالیہ کی شرح خوانین خود مقرر کرتے تھے۔ خوانین خانی کے علاقے میں موجود موروثی زمین رکھنے والے آباد کاشت کاروں سے علاقے کی مناسبت، زمین کی کیفیت اور پانی لگانے کے نظام کے مطابق پیداوار کے آٹھویں حصے سے تیسرے حصے تک مالیہ لیتے تھے۔(3) مستونگ میں 19ویں صدی کی آٹھویں دہائی سے خوانین قلات مالیے کا کچھ حصہ نقدی کی صورت میں لیتے تھے۔(4) مالیہ سال میں دو بار یعنی خریف اور ربیع کی فصلوں پر لیا جاتا تھا۔

جو کسان مالیہ دینے میں پس و پیش کرتا، یا وقت پر پورا مالیہ ادا کرنے کی سکت نہ رکھتا تو اس سے اسلحہ کے زور پر مالیہ لیا جاتا تھا(5)۔ اس کے علاوہ دہوار کسان خانہ بدوشوں کے حملوں سے اپنے دیہاتوں کو تحفظ دینے کے عوض اپنی پیداوار میں سے کچھ حصہ فیوڈلوں کو دیتے تھے۔ دہوار پشم سے کھردرے کپڑے بناتے تھے، انھی علاقوں میں قالین بنے جاتے تھے، خورجین، کمبل اور اس طرح کی دوسری چیزیں بنتی تھیں۔ مستونگ میں کپڑے اور اسی طرح رسی، جوتوں اور گھوڑے کی قیمتی زینوں پر کشیدہ کاری بہت عام تھی۔ کشیدہ کاری کا یہ کام دہوار کسان عورتیں کرتی تھیں۔(6)

زمینیں اور پانی رکھنے والے طائفوں والے زرعی نظام کی بقا صرف چھوٹے مالکوں کے مفاد میں نہ تھی (جو مل کر اپنی چھوٹی چھوٹی زمین میں پانی لگانے کے لیے ایک کاریز یا ایک نالے کے پانی سے استفادہ کرتے تھے اور مشترکہ طور پر ہی اس نالے یا کاریز کی صفائی اور اسے رواں رکھنے کے لیے کام کرتے تھے) بلکہ اس نظام کی موجودگی فیوڈل حکمران طبقہ کے مفاد میں بھی تھی۔ اس نظام میں طائفہ وقت مقررہ پر فیوڈل حکمرانوں کی طرف سے معین کردہ مالیہ دیتا تھا اور اسی طرح طائفہ کے ممبر دیگر فیوڈلی بیگار اور پابندی پوری کرتے تھے۔(7)

ملک فیض محمد یوسف زئی کے والد کا نام ملک در محمد تھا اور دادا کا پیر محمد۔ ملک صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے آباؤ اجداد اپنے ابتدائی مسکن سے جھگڑ کر مستونگ آئے یا انہیں کوئی سیاسی آفر ہوئی تھی۔ ان کے گھر میں البتہ درانیوں کی سندات موجود ہیں جن پر پچاس پچاس مہریں لگی ہوئیں ہیں۔ مگر ان کو پڑھنے کے بعد کوئی ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ جب خان خدائیداد خان کو قید کیا گیا تھا تو ملک صاحب کے دادا نے کچھ شورش کی تھی۔ تب اس کو پانچ دیگر سفید پوش معتبرین کے ساتھ انگریز نے لورالائی بھجوا دیا۔ پانچ برس تک وہ لورالائی میں جلا وطن رہا۔ پھر خوانینِ قلات خود اس کے دشمن بن گئے۔ اس کے دادا کے ساتھ انہوں نے بہت زیادتی کی تھی۔ اس نے ان کے ایک کیپٹن کو گولی ماردی تھی اور خود بھاگ کر کوئٹہ آ گیا تھا۔ سنڈیمن کا دور تھا، اس نے اس کو پناہ دی۔ اور اس وقت تک اپنے ساتھ رکھا جب تک کہ خوانین قلات کے ساتھ اس کا تصفیہ نہ ہوا۔ وہ فیصلہ نامہ ابھی تک ملک صاحب کے کاغذات میں موجود ہے۔ خوانین نے گیارہ ہزار روپیہ خون بہا لیا اور

معاملہ طے ہو گیا۔

ملک صاحب کے دو بھائی تھے۔ ایک اس کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا۔ پھر ملک صاحب خود بچھڑ گیا۔ یوں ان میں سے صرف ایک بھائی حیات ہے۔ ملک صاحب کی تاریخ پیدائش کا معلوم نہ ہو سکا البتہ وہ زلزلہ عظیم میں اُنیس برس کا تھا۔ اس طرح اُس کی پیدائش کا سال 1916ء بنتا ہے۔

''اسی زلزلے میں اس کی بیوی فوت ہو گئی، ایک بچہ تھا وہ بھی فوت ہو گیا''۔ ملک فیض محمد یوسف زئی تقریباً نوے (90) برس کی عمر میں فوت ہو گیا۔ وہ کہا کرتا تھا: ''میری عمر جس قدر زیادہ ہو میں اسی قدر زیادہ فخر کرتا رہوں گا''۔ کہ عمر تو خود ایک سند ہوتی ہے تجربے کی، ڈگری ہوتی ہے مشاہدے کی۔

ملک صاحب نے تعلیم پڑنگ آباد ہی میں حاصل کی۔ اس کے زمانے میں ایک سکول پڑنگ آباد میں ہوتا تھا' ایک مستونگ میں اور ایک قلات میں۔ یہ دراصل خان قلات سرکار کے سکول تھے۔ ملک فیض محمد پڑنگ آباد کا انڈر میٹرک تھا۔ مزید تعلیم کے لیے مستونگ گیا تو تھا لیکن وہاں سیاست کی زلف کا اسیر ہو گیا۔ ہوا یوں کہ وہاں اس کے دو چار عزیز بھی پڑھتے تھے۔ ان کے توسط سے اسے سیاست اور تحریک سے واقفیت ہو گئی۔ ان لڑکوں نے ملک صاحب کو دو چار کتابیں دیں اور ملک صاحب فکری طور پر ''کلٹی'' ہو گیا۔ یہ کتابیں ترکی کے کمال اتاترک کے حالاتِ زندگی اور انقلاب پر تھیں۔ یوں ملک صاحب ''انجمن اتحاد بلوچاں'' میں بھرتی ہو گیا۔ اس کی روایتی تعلیم کا سلسلہ جاتا رہا اور وہ سیاسی کام میں منہمک ہو گیا۔ مگر بعد میں اس نے منشی فاضل کیا اور ادیب بھی کیا۔ دونوں امتحانوں کی کامیابی پر اسے جیل سے میر عبدالعزیز کرد نے خط کے ذریعے مبارک باد دی۔ ملک صاحب کے استاد سب کے سب پنجابی تھے۔

انجمن کی ایک کوشش یہ بھی تھی کہ بلوچستان سے نان لوکل افسر نکل جائیں مگر کامیابی جا کر 1970ء کی دہائی میں ملی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اے سی، ڈی سی یہیں رہے اور صرف ماسٹر اور پٹواری چلے گئے۔

قلات کی فیوڈل ریاست میں تعلیم کا حال بھی دلچسپ تھا۔ اس سے قبل محترم یوسف علی مگسی اور عبدالعزیز کرد نے اپنے مشہورِ عالم پمفلٹ ''شمس گردی'' میں قلات کی فیوڈل ریاست

میں تعلیم کی حالت یوں بیان کی:

''ریاست ہذا کے گزشتہ دورِ حکومت میں یعنی انگریزوں سے پہلے قلات کا باقاعدہ دستور تھا کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں مساجد کے پیش امام مقرر تھے جو لوگوں کو مذہب سے آگاہ رکھتے تھے اور بچوں کو نوشت وخواند کی عربی و فارسی تعلیم دیتے تھے۔ ہندو رعایا کے منادر میں پنڈتوں کے ذریعے یہ خدمت سرانجام کرائی جاتی تھی۔ دربار قلات کی طرف سے ان مدرسینِ مساجد و منادر کو کہیں جنس کی صورت میں کہیں نقدی کی صورت میں مواجب کے نام سے معاوضہ ملتا تھا۔ اور اس طرح سے حکومت اپنے تعلیمی فرائض سے سبک دوش ہو جایا کرتی تھی۔

''1930 کے زمانے میں وزیر اعظم شمس شاہ نے فیوڈل ریاست میں تعلیم کے فروغ کو باقاعدہ روک دیا۔ صرف برائے نام' ریاست میں ایک مڈل سکول اور بارہ پرائمری مدارس ہیں۔ کم از کم اس ریاست میں پچاس پرائمری مدارس ہونے چاہئیں۔ بیس مڈل اور چار ہائی اور ایک کالج۔ پرائمری مدارس ہر ایک بڑے دیہاتی شہر، مڈل سکول ہر ایک نیابت کے صدر مقام اور چار ہائی سکول سراوان' کچھی، جھالاوان اور مکران کے مرکزی ہیڈ کوارٹروں میں اور کالج ریاست کے دارالخلافہ قلات میں ہونا چاہیے''۔

''شمس گردی'' میں سکول ماسٹروں کے بارے میں بہت دلچسپ انکشافات درج ہیں: ''بالکل ناتجربہ کار اور ناقابل مدرسین رکھے جاتے ہیں جو بہ استثنائے اساتذہ کے باقی ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو پہلے بازاروں میں خطوط نویس تھے۔ اور جن کو عام قابلیت سے تمام انڈیا میں نوکری نہیں ملی وہ اس ریاست میں آ کر مدرس بنے بیٹھے ہیں۔ جن میں اکثر بداخلاق اور لفنگے لوگ ہوتے ہیں جن کی شرم ناک کارستانیاں اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو عریاں کر کے اس مکتوب کے صفحات کو غیر تہذیب بنا دیا جائے۔ طلبا کی علمی لیاقت سے متعلق صرف اس سے اندازہ لگایا جاوے کہ مستونگ مڈل سکول کے مڈل پاس طلباء کو برٹش بلوچستان کے گورنمنٹ سکولوں میں بمشکل پرائمری کلاسوں میں لیا جاتا ہے''۔(8) ۔ وہاں سارا کورس اردو میں ہوا کرتا تھا۔ کوئی بورڈ، یونیورسٹی وغیرہ، نگرانی کے لیے موجود نہیں تھا۔ وہیں سکول کے اندر آٹھویں جماعت تک کے

امتحانات لیے جاتے تھے۔ ماسٹروں کی تنخواہیں خان قلات دیتا تھا۔ تعلیم کے لیے دو تین لاکھ روپے کا بجٹ ہوا کرتا تھا۔ اس بجٹ کو نیشنل پارٹی کی جدوجہد کی بدولت بڑھا کر سترہ لاکھ کر دیا گیا اور پھر یہ پچپن لاکھ تک ہو گیا۔ انگریز کی بہ نسبت خان قلات کے سکولوں کے نصاب میں عربی کی طرف توجہ ذرا زیادہ تھی اور سکول دینیات کا درس دیتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ریاست قلات میں سیکولر تعلیم نہ تھی، نہ ہی ان سکولوں میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ چوں کہ سکولوں میں صرف مذہب پڑھایا جاتا تھا اس لیے ملک صاحب کو مسجد میں بھی پڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا خاندان مذہبی ہونے کے باوجود جانتا تھا کہ مسجد میں ملا قرآن شریف پڑھاتا ہے اور سکول میں بھی۔ خان قلات کی ریاست میں تعلیم کے لیے کوئی پروپیگنڈہ کوئی مہم موجود نہ تھی۔ اسے تعلیم پھیلانے میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ریاستی لوگ نوکری کے حصول کے لیے تعلیم حاصل کرتے تھے اور خان نے بھی اپنی حکومت کے لیے منشی اور افسر پیدا کرنے کے لیے محدود طور پر سکول کھولے تھے۔ جولائی 1945ء میں قلات نیشنل پارٹی کی جنرل باڈی نے اپنے اجلاس میں تعلیم کے بارے میں یہ قرارداد منظور کی:

''......اگرچہ ریاست قلات کے مالیہ دہ علاقوں میں، جن کا نظم ونسق براہ راست اعلیٰ حضرت خان معظم اور وزیراعظم کے ہاتھ میں ہے۔ بیس بائیس برائے نام سکول بھی ہیں جن میں ایک ہائی سکول ہے لیکن ریاست قلات کے طویل وعریض رقبہ اور آبادی کے پیش نظر ان سکولوں کی حیثیت سمندر میں ایک قطرہ کی حیثیت سے بھی کم ہے اور ان سکولوں میں بھی اساتذہ کی کمی سامان نوشت وخواند کا فقدان ہے، درس وتدریس کے لیے عمارتوں اور اساتذہ کے لیے جائے رہائش کی قلت ہے۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقوں میں آج تک خان معظم، وزیراعظم اور قبائلی سرداروں نے تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے، حالاں کہ قبائلی علاقوں میں تعلیم نہ پھیلانے کی ذمہ داری خان معظم پر سرداروں سے زیادہ عائد ہوتی ہے''۔

انجمن اتحادِ بلوچاں میں ملک صاحب کی شمولیت کا عمل بھی دلچسپ ہے۔ انجمن کے لوگ یاسین شریف پر دستخط کیا کرتے تھے۔ ایک علیحدہ عہد نامہ ہوا کرتا تھا، اس پر بھی دستخط کرنے ہوتے تھے۔ اور یاسین شریف پر بھی۔ یہ بہت خفیہ عمل ہوتا تھا۔ ملک صاحب تین ماہ تک اپنے ساتھیوں کو

نہیں جانتے تھے؛ سوائے ایک دو کے، جوان کے ساتھ کام کرتے تھے۔

اتحادِ بلوچاں کے ختم اور منتشر ہونے کے بعد حالات ایک ایسا کام چاہتے تھے جو کہ انگریزوں کو برا نہ لگے۔ چنانچہ مئی 1936ء میں قلات کے سیکرٹری تعلیم میر محمد فاضل کی سربراہی میں مستونگ میں ''انجمن اسلامیہ قلات'' کی بنیاد رکھی گئی جس کا صدر میر گل خان نصیر اور جنرل سیکرٹری ملک عبدالرحیم خواجہ خیل بنے۔ چوں کہ اس انجمن کی سرگرمیوں میں تعلیم یافتہ نوجوان حصہ لیتے تھے اور وہ اس میں نیشنلسٹوں والے کام کرتے تھے اس لیے بہت جلد یہ انجمن دہشت پسندوں کی انجمن کے نام سے مشہور ہوئی۔(9)

اسی طرح 1936ء میں خان عبدالصمد خان اچکزئی جیل سے باہر نکلا تو ایک ہفت روزہ کی اشاعت کے لیے کام شروع کیا۔ 'استقلال' نامی پرچہ نکالا اور اس کے بعد ''انجمن وطن'' نامی پارٹی بنائی، جس کا تعلق انڈین نیشنل کانگریس سے تھا۔

5 فروری 1937ء میں اتحادِ بلوچاں کے راہنما سیوی میں جمع ہوئے اور ایک نئی پارٹی قائم کی جس کا نام قلات نیشنل پارٹی رکھا۔ اس لیے کہ قلات اسلامیہ انجمن کو روشن فکر بلوچوں نے مسترد کیا تھا۔ نئی پارٹی کا صدر عبدالعزیز کرد تھا اور گل خان نصیر نائب صدر، آرگنائزر ملک عبدالرحیم اور ملک فیض اس کے جنرل سیکرٹری (10)۔ اس پارٹی کا منشور یکم اپریل 1937ء کو نافذ ہوا۔ پارٹی کے کل پینتالیس مطالبات تھے جن میں یہ اہداف بھی شامل تھے کہ قلات ریاست کی ذمہ دار حکومت مستجار اور غیر مستجار بلوچ علاقوں کو ریاست قلات میں شامل کر دے۔ ملک میں تعلیمی اقتصادی اور اجتماعی ترقی کی خاطر جدوجہد پارٹی کے بنیادی مقاصد قرار دیے گئے۔(11) پارٹی نے قلات کے خان سے یہ مطالبے کیے:

1۔ خون کا دیت مساوی ہو۔

2۔ ''زرسر'' اور ''زرشاہ'' نامی ٹیکس، جو کہ سردار جمع کیا کرتے تھے، ختم کیے جائیں۔

3۔ بے گار بند ہو۔

4۔ مالی، پرسی اور بجار کی شکل میں سرداری ٹیکس ختم کیے جائیں۔

پارٹی کے سرگرم لوگ ریاست قلات کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے رہے اور لوگوں سے مطالبہ کرتے رہے کہ وہ ٹیکس دینے سے انکار کر دیں۔ چنانچہ سب سے پہلے جھالاوان کے لوگوں نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔

پارٹی کا کام کچھ عرصے تک اچھی طرح چلتا رہا لیکن خان قلات نے پارٹی کے صدر میر عبدالعزیز کرد کو اچانک جھالاوان میں وزیر کے نائب کی حیثیت سے مقرر کیا۔ کرد صاحب کے اس عہدہ کو قبول کرنے سے قلات نیشنل پارٹی کو سخت دھچکا لگا۔

پارٹی سے میر عبدالعزیز کرد کی علیحدگی کے نتیجے میں مستونگ میں اس کی مجلس عاملہ کی میٹنگ طلب کی گئی اور ایک سردارزادہ میر شہباز خان نوشیروانی کو صدر بنا دیا گیا۔ وہ ابراہیم عطائی صاحب کے بقول پولیٹیکل ایجنٹ کا ساتھی اور بااعتماد آدمی تھا۔(12)

3 اکتوبر 1938ء کو بھاگ ناڑی کے علاقے میں پارٹی کے اُن ممبروں نے اجلاس منعقد کیا جو شہباز خان کے مخالف تھے۔ اس کے بعد لہڑی، گنداواہ، اور ڈھاڈر میں بھی اس طرح کے جلسے منعقد ہوئے۔ سب نے شہباز خان کی مخالفت کی۔ اس طرح اسے صدارت سے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کو پارٹی کا سربراہ بنا دیا گیا۔

1939ء میں انگریزوں نے کوشش کی کہ جیونی کی بندرگاہ کو خان سے اجارے پر حاصل کریں مگر قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی سخت مخالفت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا۔ مگر اس دوران ایک اہم واقعہ ہوا۔ قلات نیشنل پارٹی نے ایک جلسہ منعقد کیا جس پر سرداروں نے حملہ کیا۔ بعد کے آنے والے وقتوں میں اس جلسے کے بہت چرچے رہے۔ خوش قسمتی سے سرداروں کے حملے والے اس جلسے کی کارروائی کے کچھ حصے بابو (عبدالکریم امن) کے ذخیرے سے ہمیں ملے ہیں۔ یہ چوں کہ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے، اس لیے اسے یہاں نقل کرنا اشد ضروری ہے:

''قلات نیشنل پارٹی کے سالانہ اجلاس کی پہلی نشست

مورخہ 5 جولائی 1939ء

پروگرام

1- تلاوت

2- ترانہ

3- نظم

4- خطبہ استقبالیہ

5- خطبہ صدارت

6- رپورٹ سالانہ سیکرٹری جنرل

دوسری نشست

مورخہ 6 جولائی 1939 کو منعقد ہونے والی تھی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ برطانوی سامراج کی ملی بھگت سے پرامن سالانہ اجلاس پر مسلح قبائلی سرداروں سے حملہ کرایا گیا۔

خطبہ صدارت

پارٹی کے صدر ملک عبدالرحیم خواجہ خیل نے صدارتی خطبہ دیا۔

1- میں مستونگ کے باشندوں، مجلس استقبالیہ کے ممبروں، رضا کاروں کو اپنی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کی اس شفقت و ہمدردی کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ لوگوں نے سفر کی تکلیفیں برداشت کیں اور خود کو ہم تک پہنچایا اور ہمارے وہ دوست شکریہ کے بہت مستحق ہیں جنہوں نے ہماری مالی امداد کی۔ اگر آپ لوگوں کے تعاون اور انتظام کی تکلیف برداشت کرنے کا جذبہ ہمارے دلوں میں نہ ہوتا تو پھر شاید آپ کے سامنے ہم اپنی آنکھیں اٹھانے کے قابل نہ ہوتے۔

2- ریاست قلات کے ہر گوشہ سے قوم کے ہمدردوں کی جمعیت مستونگ کے باشندوں کے لیے ایک بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ یہ خدا کی کتنی مہربانی ہے کہ اس نے سب سے پہلے ہمیں قربانی و خدمت کا موقع فراہم کیا۔ اس وقت اگر ہم آپ لوگوں کی خدمت گزاری میں اپنی جان دے دیں تو کوئی بات نہیں۔ اسی احساس نے ہمیں یہ دعا کرنے پر مجبور کیا کہ خدا کرے کہ کچھی، جھالاوان، مکران کو بھی خدمت وقربانی کا موقع ملے تاکہ پوری ریاست کے لوگ قوم کے لیے متحد

ہوکر جاں فشانی سے کام کر کے ایک دوسرے کے ساتھ رشک کریں۔

3- ہمارے مہمان دوستو! آپ کو معلوم ہے کہ مہمان جتنا دوست ہوتا ہے، اس میں اتنا ہی تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور ناکامی کی صورت میں سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ ہماری روحانی کوفت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ہم نے جلسے میں آپ کے لیے خاطر خواہ انتظام کیا' آپ کی رہائش اور کھانے کا اچھا انتظام کیا ہوا ہے لیکن ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم باہر کے ان سرفروش لیڈروں کو آپ لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر سکے۔ (خان عبدالصمد اچکزئی، محمد حسین عنقا، محمد امین کھوسہ اور قاضی داد محمد صاحب) جو ہمیں عمل و آزادی کا سبق دیتے لیکن ہماری ایسی قسمت کہاں۔

4- ہمارے دل ریاست کے اس قانون سے جو کہ شمس شاہ جیسے ظالمانہ دماغ کی پیداوار ہے ریزہ ریزہ ہوتے ہیں اور وہ قانون یہ ہے کہ ریاست کی حدود میں حکومت کی تحریری اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اجازت حاصل کرنے کے لیے فیس دینا پڑتی ہے اور یہ امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ درخواست منظور ہو جائے۔ سخت افسوس ہے کہ شمس شاہی دور ختم ہو گیا' ریاست کی حکومت خان جیسے قابل و ہوشیار آدمی کے ہاتھ میں ہے لیکن یہ ظالمانہ قانون ابھی تک موجود ہے اور وہ لوگ جو قوم کی ترقی کے خواہاں ہیں، ہرگز اس قانون کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حکم غلطی یا بے خبری کی وجہ سے ابھی تک ختم نہیں ہوا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی منسوخی کی امید نہ رکھیں۔

5- دنیا کی قوموں کی یہ بڑی خواہش ہے کہ وہ ایک ہو جائیں اور ترقی کریں لیکن ہمیں نہ جانے کتنی جگہ تقسیم کیا گیا ہے۔ ملک تو وہی ملک تھا مگر ایک حصے کو لس بیلہ' دوسرے کو خاران اور تیسرے حصے کو برٹش بلوچستان کہتے ہیں۔ ہم بلوچستان کے باشندے ایک قوم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں لیکن ہمیں فرقوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے تا کہ ہم لوگوں کو آسانی سے مارا اور لوٹا جا سکے اور ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔ اس طرح ہمیں کمزور کیا گیا ہے۔ ہمارے بند بند کو ایک الگ نام دیا گیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایسا دن آئے گا کہ ہم اپنے آپ کو بلوچستانی بولتے ہوئے شرم کریں گے۔ اے جوانو! قوم کی آئندہ ترقی آپ لوگوں کے ہاتھوں میں

ہے۔ وعدہ کرو کہ جو بھی تمہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کرے گا آپ ان کو شکست دینے کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہیں گے۔

6- ریاست قلات بہت سی مصیبتوں میں گھری ہوئی ہے مگر اس قسم کے جلسوں میں ان کا ذکر کرنا ضروری ہے اور ان مصیبتوں کو بغیر جدوجہد کے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہاں جن باتوں کا ذکر کروں گا وہ بہت ضروری ہیں اور ہماری ترقی انہی چیزوں میں پوشیدہ ہے۔ ریاست قلات میں بہت سی قومیں آباد ہیں لیکن ہم حیران ہیں کہ کچھ اقوام کو سٹیٹ کونسل و شاہی جرگہ میں نشستیں فراہم کی گئی ہیں اور دوسروں کو نہیں۔ حالاں کہ ریاست کے انتظامات کا دارومدار انھی قوموں پر ہے، مثلاً سراوان کے دہوار، کچھی کے جٹ اور جاموٹ، مکران کے بہت سے فرقوں اور ہمارے ہندوؤں کو اس حق سے محروم رکھا گیا۔ کیوں؟ وہ لوگ بھلا انسان نہیں ہیں؟ اول یہ کہ شاہی جرگہ و کونسل کی تشکیل غلط ہے۔ دوم یہ کہ ہم میں چھوٹے اور بڑے کا فرق پیدا کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں حکومت کا مطلب کیا ہے۔ اگر خان ان فرقوں کے نمائندوں کو مساوات اور اصولوں کے مطابق کونسل میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خان دوسری قوموں کا خان نہیں۔ اگر خان سب کا ہے تو دوسری قوموں کے سرداروں کو کونسل میں بیٹھنے کی اجازت ہو"۔

چھ جولائی 1939ء میں مستونگ میں قلات نیشنل پارٹی کے اس جلسے پر سرداروں کے قبائلی لشکر نے مسلح حملہ کرا کے جلسہ کو درہم برہم کر دیا۔ پھر وہ سردار اس کے دوسرے دن خان قلات کے پاس پہنچ گئے اور نیشنل پارٹی پر پابندی لگانے کا مطالبہ کر دیا۔ خان نے ان سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''قبیلے میرا دایاں بازو ہیں جب کہ سردار میری سلطنت کے ممبر ہیں۔ آپ کا احترام دراصل سرداروں کا احترام ہے اور سرداروں کا احترام خان کا احترام ہے۔ اپنے جلسے میں جب نیشنل پارٹی نے تمہاری عورتوں کا ذکر کیا تو تم لوگ غصہ میں آ گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم لوگوں کے پاس ابھی تک جرأت اور غیرت موجود ہے''۔(13) واہ ڑے خان واہ، واہ ڑے سردار واہ، واہ ڑے قبائل واہ اور واہ ڑے غیرت واہ۔ بلوچستان میں غیرت تو وہ امرت دھارا ہے جسے (پاکستان میں مذہب کی طرح) ہمیشہ خطرہ لاحق ہوتا ہے اور جب بھی خان اور فیوڈل کے مفادات

کوخطرہ پکڑتا ہے، غیرت شلوار کے پائنچے اور قمیص کی آستینیں چڑھا کر میدان میں کود جاتی ہے اور سردار کے مخالف کے خلاف سینہ سپر ہوجاتی ہے۔ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے جلسہ کو درہم برہم کرنے سے لے کر 2013ء کے عام انتخابات تک، بلوچستان کی ساری تاریخ غیرت اور سرداریت کی اس گٹھ جوڑ کی تاریخ ہے۔

بہر حال ایک ہفتے کے اندر اندر قلات کے وزیراعظم نے ایک ''غیرت مند'' فرمان کے ذریعے پارٹی پر پابندی لگادی۔ اور ملک فیض محمد یوسف زئی صاحب سمیت پارٹی کے تمام سرگرم ممبران ریاست بدر کردیے گئے۔

یہ بلوچستان کی سیاسی تاریخ میں افتخار کی بات ہے۔جس سیاسی جلسے پر بالائی طبقات کی طرف سے اولین مسلح حملہ کیا گیا تھا وہ سیاسی جلسہ یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ''عورتوں کو تعلیم دو''............ اور یہ 1936ء تھا۔آج جب کہ اکیسویں صدی ہے، پھر بھی عورتوں کے حقوق کی طرف داری کرنے والے کئی لوگ اور کئی سیاسی پارٹیاں اس مسئلے پر معذرت خواہانہ انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔اور عوام کے شعور کی سطح کے فضول بہانے گھڑ کر اس حساس اور اہم مسئلے پر خاموش ہوجاتے ہیں۔ہمیں اپنے اسلاف پر فخر ہے کہ انہوں نے آج سے پون صدی قبل اپنے پورے سیاسی عمل کو داؤ پر لگادیا۔لاٹھیوں، اینٹوں اور جلاوطنیوں کے زخم کھائے مگر عورت کی تعلیم کے حصول کے نعرے پر کوئی سودا بازی نہیں کی۔ہم عورت کے حقوق کے لیے لڑائی سے انکار کر کے کیسے اِن اکابرین کے وارث ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟!

دوسرے دن کوئٹہ میں پارٹی کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ جتنے بھی ملازم ہیں وہ ملازمتیں چھوڑ دیں اور مکمل طور پر میدانِ عمل میں آجائیں۔سب سے پہلے ملک فیض محمد یوسف زئی صاحب نے ایک ٹیلیگرام کے ذریعے نوکری چھوڑ دی۔اس کے جواب میں اسے کہا گیا کہ ''آپ اپنی ڈیوٹی پر واپس آجائیں یا پانچ برس تک قلات ریاست کی حدود میں داخلہ ممنوع ہے۔اگر اس کے باوجود داخل ہوئے تو جرمانہ اور سزا ہوگی''۔ پھر میر فاضل خان منسٹر تعلیم نے استعفیٰ دیا، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل مستعفی ہوا۔تھوڑے دنوں بعد میر گل خان نصیر نے استعفیٰ دیا جو کہ منسٹر تھا۔میر حمل

خان گوہرام زئی نے کسٹم آفیسری چھوڑی۔ بابو عبدالکریم امن نے گلستان کی نائب تحصیل داری چھوڑی (اختیارات سے بھرے نائب تحصیل دار کی تنخواہ ایک سو دس روپیہ ہوا کرتی تھی۔اس میں گھوڑے کے پچاس روپے اور دیگر شامل کر کے رقم دو سو روپے بنتی تھی)۔بہر حال یہ سب مستعفی لوگ کوئٹہ میں جمع ہوئے، جہاں باقی لوگوں کے علاوہ مولانا عرض محمد اور مولوی محمد عمر صاحب بھی تھے۔بہت سے لوگوں کو نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔تیرہ چودہ آدمی مستونگ میں گرفتار کر لیے گئے، کچھ قلات میں گرفتار ہوئے۔اس طرح اس دوران کل ستر آدمی پکڑے گئے۔

25 اگست 1941ء کو نیشنل پارٹی نے برطانوی سرکار کے خاران کو علیحدہ ریاست میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر اعتراض کیا۔پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات بابو عبدالکریم امن نے ایک پمفلٹ کے ذریعے کہا:

''جس طرح کہ ایک انسانی جسم میں سے کسی ایک عضو کو کاٹ کر اس کو جسم کے دوسرے اعضا سے علیحدہ کیا جائے تو لازمی ہے کہ اس عضو کے علیحدہ ہونے کی صورت میں اس کو جسم کے کسی اور عضو کے چوٹ کھانے یا لگنے پر درد اور بے چینی محسوس نہ ہوگی۔کیوں کہ جب اس کا سلسلہ ربط و تعلق ہی توڑا گیا تو اس کو چوٹ کھائے ہوئے عضو کی بے چینی اور درد کیوں کر محسوس ہو۔بالکل اسی طرح جب سے کہ متحدہ ہندوستان علیحدہ علیحدہ ریاستوں اور چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں کے نظام ہائے حکومت ایک دوسرے کے نظامِ حکومت سے مختلف صورت اختیار کر چکے ہیں تو اس قطع و برید اور ردوبدل کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کہ ان ریاستوں میں رہنے والے باشندے نہ صرف علیحدہ ہو کر ایک دوسرے کے دکھ اور درد میں ہمیشہ کے لیے شریک نہیں ہوسکے ہیں۔بلکہ وہ برطانوی ہند کے تغیر پذیر حالات اور باشندوں کے دکھ درد سے بھی ناآشنا و بیگانہ چلے آرہے ہیں جیسے کہ ہم ہندوستان میں ریاستوں کی بنیاد پڑنے کے وقت کی تاریخ اور واقعات سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔کسی اور مثال کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم برطانوی ہند کے باشندوں کی مثال کو سامنے رکھ کر اچھی طرح دیکھیں کہ انہوں نے اپنے ایکے اور متحد رہنے کی بدولت نہ صرف ہندوستانی ریاستوں کے باشندوں سے مقابلتاً بہت سی مراعات حاصل کی ہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے کی تکالیف اور مصائب کا بھی پورا پورا

احساس رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگر پنجاب کے برطانوی علاقہ کے باشندے کبھی کسی دکھ میں مبتلا ہوئے ہیں یا انہوں نے کسی تکلیف کے پیش نظر کوئی مطالبہ کیا ہے تو ضرور اس کا احساس مدراس کے باشندوں کو ہوا ہے۔ اور انہوں نے پنجاب کے باشندوں کے مطالبے کی حمایت کی ہے۔ اسی طرح سے بنگال کے باشندے اگر کسی مصیبت میں پڑے ہیں تو برطانوی سندھ کے باشندے اس تکلیف سے بے چین ہوئے ہیں۔ یہ فرضی مثال نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی تحریک آزادی ہمیں سکھاتی ہے کہ سارا ہندوستان جس میں ریاستیں بھی شامل ہیں، ایک جسم ہے اور اس میں رہنے والے سارے باشندے اس کے اعضا۔ اس موٹے اصول اور نظریہ کے پیش نظر جب کہ ہم سارے ہندوستان کو ریاستوں سمیت ایک متحد لڑی میں پرو کر آزاد و خود مختار دیکھنے کے آرزومند ہیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ خاران اور مکران یا جھالاوان کی ریاست قلات سے علیحدہ ریاستوں کی شکل میں ہم کیسے اور کیونکر جدا دیکھ سکتے ہیں اور یا اپنے خارانی اور مکرانی بلوچ بھائیوں سے اپنے برادرانہ تعلقات کو ہمیشہ کے لیے کیسے منقطع کر سکتے ہیں۔ فرض کرو آج خاران میں ایک چھوٹے رقبہ کا علاقہ جس کا کل رقبہ اٹھارہ ہزار مربع میل اور آبادی تیس ہزار اور آمدنی ایک لاکھ کے قریب ہے وہ خود ایک ریاست کی پوزیشن حاصل کر لیتا ہے تو خاران کے علیحدہ ہونے اور ایک علیحدہ ریاست کی پوزیشن حاصل کرنے کی نظیر کو سامنے رکھ کر کل کو اس سے یہ امکان نہیں ہو سکتا ہے کہ نواب بائی خان بھی یہ کہہ کر مکران کو ایک علیحدہ ریاست بنانے کی مہم شروع کر دے کہ جس صورت میں خاران ایک چھوٹے رقبہ کا علاقہ ایک علیحدہ ریاست بن سکتا ہے تو مکران جس کا رقبہ خاران سے بڑا ہے اور آبادی بھی تگنی' آمدنی بھی زیادہ۔ علاوہ اس کے وہ تجارتی بندرگاہ بھی رکھتا ہے، کیسے ایک علیحدہ ریاست کی پوزیشن حاصل نہ کرے۔ جہاں تک میری اطلاعات کا تعلق ہے مکران میں بھی یہ شوشہ اٹھایا گیا ہے۔ ممکن ہے اور خدا کرے کہ غلط ہو۔ بہت ممکن ہے کہ جھاوان کے سردار صاحبان بھی خاران اور مکران کی دیکھا دیکھی سے اپنی علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی جدوجہد شروع کر دیں۔ کیا پھر اس افراتفری اور ریاست گردی کا یہ نتیجہ نہ ہوگا کہ ریاست قلات جو موجودہ وقت (اگرچہ صحیح معنوں میں نہیں) ایک رہے سہے بلوچی محاذ کا نام ہے اور وقت آنے پر ہم اسی محاذ کے

نام پر متحدہ بلوچی محاذ قائم کر سکتے ہیں، چھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر ہمارا بلوچی شیرازہ ہمیشہ کے لیے تار تار ہو جاوے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو اس بلوچی شیرازہ کا بکھر جانا ضروری اور یقینی ہے۔ گو کہ ریاست قلات کی موجودہ بدنظمی اور عاقبت نااندیشی سے مجھے انکار نہیں ہو سکتا اور کہ اسی عاقبت نااندیشی اور بدنظمی ان غلط کارمشیروں کے ان غلط مشوروں جن سے متاثر ہو کر خاران کے نہتے باشندوں پر حملہ کیا گیا' کی بدولت آج یہ نامسعود صورت حالات درپیش ہوئی ہے۔

مگر کیا انصاف اور دوراندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم حکومت قلات کی موجودہ بدنظمیوں اور غیر مآل اندیشانہ روش کو دور کرنے کی بجائے اور غفلت کے مرتکب ہو جائیں جو ابدالاباد ہماری ذلت وافتراق کے اسباب لیے ہوئے ہو۔ میرے خیال میں بلکہ ہماری بلوچی شان اور روایات کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے کردار وعمل سے حکومت قلات کی موجودہ بدنظمیوں اور غلط روشانہ خامیوں کو دور کریں۔ اور بلوچ قوم کے سارے منتشر عناصر کو اتحاد و برادری کی ایک لڑی میں پرونے کے لیے اپنی جدوجہد شروع کر دیں۔

اس کے علاوہ آج جب کہ دنیا کی صورت حالات ہی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم سوائے ایک ہونے اور متحد رہنے کے زندہ نہیں رہ سکتے تو ایک ایسے نازک مرحلے پر اس سے بڑھ کر ہماری غیر مآل اندیشی اور غفلت کیا ہو سکتی ہے کہ خاران کے بلوچ بھائی جھالاوان اور ریاست قلات کے دوسرے باشندوں سے یا مکران جھالاوان کے بلوچ بھائی خاران اور ریاست کے دوسرے باشندوں سے بیگانوں کی طرح الگ رہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے غم و شادی میں شریک نہ ہوں۔

آج سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ ریاست قلات کے تمام بلوچ ہی نہ صرف اپنے جھالاوانی اور مکرانی نیز سراوانی وغیرہ سردار صاحبان کو متحدہ صورت میں یہ کہہ کر آگاہ کریں کہ موجودہ بین الاقوامی پیدا شدہ نازک صورت حالات کے پیش نظر یہ امر کسی طرح قرینِ مصلحت نہیں ہو سکتا کہ مکرانی یا جھالاوانی بھائی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا جدا مسجدیں بنائیں اور ہمیشہ کے لیے بلوچ قوم کے افتراق کے باعث بنے رہیں۔ بلکہ حکومت انگریزی جس کے حکم سے خاران جو حال ہی

میں اورلسبیلہ جواس سے پہلے ریاست قلات سے کٹ کر علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں تقسیم ہوئے ہیں، سے پرامن اور آئین کے اندر رہ کر ریاست کے کونے کونے میں جلسے کر کے مطالبہ کریں کہ وہ خاران اورلسبیلہ کو ریاست قلات کی طوائف الملوکی اور ریاست گردی کے دور دورہ کو ختم کرے گی اور ریاست قلات کے غریب باشندوں کو اپنی ترقی کا موقع دے گی۔

اے کے۔ابوالانقلاب بلوچستان۔

(بابو عبدالکریم امن)''

واضح رہے کہ قلات نیشنل پارٹی کی سرگرمیوں پر پابندی دوسری عالمی جنگ کے بعد تک برقرار رکھی گئی۔اس صورت حال میں نیشنل پارٹی کے ممبروں نے محمد علی جناح سے خانی میں جمہوری تحریک کی حمایت کے لیے رابطہ کیا جو کہ خان کے لیگل ایڈوائزر تھے۔انہوں نے جناح سے خان پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کی درخواست کی۔واضح رہے کہ خان قلات 1936ء میں مسلم لیگیوں سے متعارف ہوگیا اور اس نے 1942ء میں مشہور وکیل محمد علی جناح سے ملاقات کر کے اس سے مطالبہ کیا کہ انگریزوں سے آزادی کے حصول میں اس کی مدد کرے۔1945ء میں جب جناح صاحب اور مس جناح ممبئی سے بلوچستان آگئے تو اس نے مہمانی میں دونوں کو ان کے وزن کے برابر چاندی اور سونا دے دیا۔اس کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ کا ایک ہار مس جناح کو دے دیا۔(14) بہرصورت جناح نے قلات نیشنل پارٹی کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ان حالات میں پارٹی نے نہرو سے رابطہ کیا جس نے کانگریس پارٹی کی طرف سے تعاون کا وعدہ کیا۔1944ء کے اواخر میں آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانگریس میں نیشنل پارٹی بھی شامل ہوئی۔(15) ملک فیض محمد یوسف زئی اپنے دیگر رفقا کے ساتھ 1945ء میں مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد سے ملے اور انہیں اپنی جدوجہد سے آگاہ کیا۔یوں' قلات کا مسئلہ ایک مقامی مسئلہ نہ رہا بلکہ ہندوستان میں ہر سامراج دشمن اجتماع میں قلات نیشنل پارٹی کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کی قراردادیں منظور ہونے لگیں۔

7,6 اور 8 اگست 1945ء کو سری نگر کشمیر میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر صدارت

تمام ہندوستان کی ریاستوں کی انجمن کی سٹینڈنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، جس میں قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے ساتھ الحاق کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا اور ذیل کی قرارداد پاس کی گئی:

''آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانفرنس کمیٹی کو معلوم ہوا کہ ریاست قلات کی حکومت نے ریاست میں قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی جدوجہد پر پابندی لگا کر پریشان کن پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ملک عبدالرحیم خان صدر اور دوسرے سرکردہ کارکنوں کو ریاست کی حدود کے باہر رکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور بلوچستان سے بعض قومی اخبارات کے داخلے کو ریاست قلات میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔یہ کمیٹی اس پالیسی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور خان قلات سے مطالبہ کرتی ہے کہ موجودہ حالات اور ہندوستان اور دنیا میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر خان قلات اس طرح کی تمام پابندیوں کو دور کر کے شہری آزادی اور نیشنل پارٹی کا پرامن جائزہ لے''۔

پانچ سال پورے ہونے پر احمد یار خان نے نیشنل پارٹی سے مفاہمت کر لی۔اس طرح ملازمتیں بحال ہونے پر ملک فیض محمد یوسف زئی صاحب سیکرٹری ٹرانسپورٹ مقرر ہوا۔

مورخہ 5 اپریل 1945ء کو بمقام قلات' سٹیٹ کونسل کا ایک اجلاس ہوا جس میں چند قبائلی سرداروں نے جو اس کونسل کے نامزد ممبر تھے۔حکومت قلات کو چند مطالبات پیش کیے، تاکہ حکومت قلات کے نظم ونسق کو موجودہ نام نہاد سٹیٹ کونسل کے مکمل کنٹرول میں دے دیا جائے۔اور قبائلی علاقوں میں بھی سرداروں کے موجودہ اختیارات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے ان کو قبائل پر مکمل اختیار دے دیا جائے۔باالفاظ دیگر ریاست قلات اور اس کے مظلوم وخستہ حال رعایا کو اس برائے نام سٹیٹ کونسل کے حوالے کیا جائے جو ریاست قلات کے باشندوں کا صحیح نمائندہ نہیں۔

قلات نیشنل پارٹی نے اپنے ایک اجلاس میں قلات سٹیٹ کونسل کے بارے میں اپنے رویے کا یوں اظہار کیا:

''قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کا یہ اجلاس سٹیٹ کونسل کے متذکرہ مطالبات کو بہ نظر استحسان

نہیں دیکھتے ہوئے اس رائے کا ہے کہ سرداروں کے متذکرہ بالا مطالبات میں حکومت قلات کے شیرازہ بکھر جانے اور ریاستی عوام میں بے چینی اور بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ ریاست قلات کے منجملہ قبائل میں سے بھی نصف سے زیادہ قبائل کو' سٹیٹ کونسل میں برائے نام نمائندگی حاصل نہیں نیز مالیہ دِہ طبقہ کو بھی جن پر ریاست قلات کی تمام تر آمدنی کا دارومدار ہے، اس کونسل میں کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ حالاں کہ ان کا حق سٹیٹ کونسل کے ان نامزد ممبروں سے جو حکومت قلات کے خزانہ میں اپنی آمدنی سے ایک کوڑی بھی داخل نہیں کرتے بدرجہا مقدم ہے۔ علاوہ ازیں عرصہ تیس سال سے جب کہ قبائل کو ان کے منشا کے خلاف سرداروں کے اختیار میں دے دیا گیا ہے۔ سرداروں نے اپنے قبائل کے سود و بہبود کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے قبائل کو اپنے مظالم اور بے جا ستانیوں سے جاں بلب کر دیا ہے، جب 1939ء میں حکومت ہند نے قبائلی سرداروں کو حکومت قلات کے کنٹرول میں دے دیا اور حکومت قلات کی طرف سے بھی ریاستی عوام کی منشا کے خلاف سرداروں کو ریاست قلات کے نظام حکومت میں کسی حد تک دخل دینے کا موقع دیا گیا تو اس اہم تغیر سے سرداروں کے ناجائز اقتدار اور اختیارات میں مزید اضافہ ہوا۔ اور انہوں نے اپنے جابرانہ سلوک اور قابلِ اعتراض رویے سے مالیہ دِہ علاقہ کی حالت کو بھی جو قبائلی علاقہ سے کسی قدر بہتر تھی' بد سے بدتر بنا دیا۔ جس سے ریاست قلات کے عوام میں حکومت اور سرداری نظام کے خلاف ایک ہمہ گیر بے چینی اور بداعتمادی پھیل گئی۔ اس بے چینی بداعتمادی اور عوام میں بیداری پیدا ہونے کی وجہ سے سرداروں کو اقتدار کے لٹنے کا خطرہ محسوس ہوا۔

لہٰذا انہوں نے اپنے قبائل پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے اور باقی ریاست کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لینے کا مطالبہ کیا تا کہ حکومت کی طاقت کے بل بوتے پر ریاست کی قومی تحریک اور عوام کی بیداری کو کچل کر اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو بحال رکھ سکیں۔ حکومت سے اپنے قبائل پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کا مطالبہ بھی ثابت کرتا ہے کہ سرداروں کو اپنے قبائل کا اعتماد حاصل نہیں۔ حالاں کہ اب تک قبائل ان کے قبضہ اقتدار میں ہیں۔ نیز قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کا یہ

اجلاس سٹیٹ کونسل سے ان سرداروں کے احساسات کی بھی قدر کرتا ہے جنہوں نے ان ناقابلِ قبول اور غیر پسندیدہ مطالبات کی مخالفت کرتے ہوئے سٹیٹ کونسل میں مالیہ دِہ طبقہ کے منتخب نمائندوں کو شامل کرنے اور سرداری سسٹم کو بذریعہ عام انتخابات عمل میں لانے کی رائے ظاہر کی ہے۔ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی یہ رائے ہے کہ ریاست قلات کی تمام مشکلات کا حل صرف وہ نمائندہ حکومت کر سکتی ہے جس میں تمام باشندگان ریاست قلات کو بذریعہ عام انتخابات حقِ نمائندگی حاصل ہو۔(16)

یہ قرارداد ظاہر کرتی ہے کہ بلوچستان کے سیاسی لوگوں نے سرداری نظام کے خلاف آج سے جدوجہد شروع نہ کی بلکہ یہ نصف صدی سے سیاسی اور جمہوری عناصر کی سیاست کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ ہماری تاریخ سے ایسی ساری باتوں کو گول کر دیا گیا ہے جو ہمارے اسلاف کے سیاسی پروگرام کا مغز ہوا کرتی تھیں۔ آج کے دانشور اور تاریخ دان کا یہ فریضہ بنتا ہے کہ وہ اپنے اکابرین کی سیاست کے اندر موجود ان تمام عوام دوست اور انقلابی حصوں کو دوبارہ ڈھونڈ کر عوام کے سامنے لائیں جنہیں عوام سے بورژوا دانش وروں نے جان بوجھ کر چھپا دیا تھا۔

بعد میں جب دارالعوام اور دارالامرا کے انتخاب ہوئے تو ملک فیض محمد دارالعوام کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اس دور میں کیا کیا گردن توڑ قسم کے واقعات ہو رہے تھے۔ دوسری عالمی جنگ، ہندوستان کی آزادی، بے شمار ممالک میں سوشلزم کا قیام..........ایک دنیا بدل رہی تھی۔

اپریل 1952ء میں قلات اور دیگر فیوڈل ریاستیں جو کہ خان قلات کے زیر تسلط تھیں، 'بلوچستان کی ریاستوں کی وحدت' میں شامل کی گئیں۔ اس اتحاد میں چار ریاستیں (قلات، خاران، مکران اور لسبیلہ) شامل ہو گئیں اور اسے خان قلات احمد یار خان کے حوالے کیا گیا۔(17)

اسی اثنا میں 1954ء میں شہزادہ عبدالکریم جیل سے رہا ہوا اور اس نے بلوچستان میں سابقہ سٹیٹ نیشنل پارٹی کی جگہ پر ''اُستمان گل'' نامی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ تحریک چلتی رہی، ملک فیض اپنے ساتھیوں سمیت جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھا۔

1955ء میں خان قلات احمد یار خان کو کراچی لے جایا گیا اور وہاں ون یونٹ کے پروگرام پر اس سے دستخط کرائے گئے۔ ریاست قلات کو بھی آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ خاران اور مکران ویسے یونٹ میں شامل کر دیے گئے اور لسبیلہ کو بلوچستان سے کاٹ کر کراچی میں ڈال دیا گیا۔

چنانچہ جبر کا ایک اور دوزخ کھلا۔ ملک بھر کے شریف لوگ اس ون یونٹ کے خلاف جُت گئے۔ ون یونٹ کے خلاف ملک صاحب کی جدوجہد اس کے استقلال کی علامت تھی۔ حبیب جالب کی طرح جیل اور ریل اس کے ٹھکانے رہے۔ 1973ء کی لڑائی میں وہ پھر گرفتار ہوا۔ اور آٹھ برس قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ کیا لوگ تھے!۔ مچھ جیل آٹھ برس قید اور وہ بھی قید با مشقت !! ۔اُدھر اُس کا پیر میر غوث بخش بزنجو حیدرآباد جیل میں تھا۔ دو سیاست دان دو پل چوری کر کے ایک دوسرے سے سیاست کی باتیں کرتے، ڈھارس و امید کی باتیں کرتے، ریاضت و سیاست کی باتیں کرتے۔

بزنجو نے ملک فیض کو ایک قیدی کے ذریعے خط بھیجا: ''سناؤ بھائی! آپ جس زندان خانے میں ہیں، یہ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ جیل کے بارکوں نے ظلم وستم کے جو مناظر دیکھے ہوں گے، وہ آپ کو ضرور سنا چکے ہوں گے۔ ان در و دیوار نے بھی آپ سے بات کی ہوگی، جنہوں نے محبّ وطن نوجوانوں کو بلوچستان زندہ باد کہتے ہوئے دار پر چڑھتے وقت دیکھا تھا۔ جیل کے احاطے نے بیدزنی کی وہ آوازیں جو رضاکاروں کو ٹکٹکی باندھ کر مارا جاتا تھا، گوش گزار کی ہوں گی۔ ان کا جرم صرف مادرِ وطن کے حق میں اور سامراج کے خلاف صف آرا ہونا تھا......''

پھر ہمیں یاد ہے ملک صاحب کو ایک بار پھر جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اب کی بار یہ ضیاالحق کا دور تھا۔ اسی طرح ملک صاحب نے ایم آر ڈی کی مارشل لا دشمن تحریک میں گرفتاری دی اور جیل میں پڑا رہا۔ ایم آر ڈی کی تحریک کے سلسلے میں ڈیرہ مراد جمالی سے ملک صاحب نے بابو شورش کو خط لکھا تھا۔ ملک صاحب کے خط کا اگر چار سو سال قبل قندھار کے فیوڈل حکمران کی قید میں پڑے بیورغ کی شاعری سے موازنہ کیا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جیل انسانی تاریخ

میں کتنے بڑے ٹیلنٹ کو ضائع کرنے کا باعث بنی ہے:

''......جیل کے منحوس اثرات نے دل و دماغ پر کچھ اس نوعیت کے تاثرات مرتب کر لیے ہیں کہ ذہن کچھ لکھنے یا ترتیب وتدوین یا وضاحت بلاغت کی زبان سے (تحریر کو) آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے تیار نہیں......''

ملک صاحب کارواں کے اپنے دیگر ساتھیوں کے ہم راہ ساری زندگی مشکل مورچوں میں لڑتا رہا۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے لوئی فشر نے کہا تھا: ''ایک نئے عالم کی ضرورت ہے، نیا عالم کہاں ہے؟ روشن مستقبل کہاں ہے۔ یہ ان باغیوں کے ہاتھوں میں ہے، جن کے پاس ایک واضح لائحہ عمل ہوگا۔ وہ افراد جن کے پاس نئے نئے خیالات ہوں گے۔ وہ لوگ جو دلیرانہ ایک کٹھن راہ پر چل کھڑے ہوں گے۔ جب کہ دونوں طرف سے ان پر تیروں کی بوچھاڑ پڑ رہی ہو''۔

ملک فیض محمد اپنی زندگی کے آخری دنوں تک کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ ہسپتال میں اس کے پاس ہمیشہ دو تین کتابیں ہوتی تھیں۔ اس کے نزدیک کتاب سے بڑا رفیق دنیا میں نہیں ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جس شخص کو خداوند کریم نے کتاب پڑھنے کی طرف متوجہ کیا، وہ میرے نزدیک دنیا کا بہترین آدمی ہے۔ ملک صاحب انگریزی میں بقول اس کے اپنے بالکل ''چٹ'' تھا۔ بس اردو پر ہی گزارا کرتا تھا۔ اسے مستونگ کی لائبریری سے اچھی کتابیں مل جایا کرتی تھیں، کوئٹہ آ کر خود بھی خریدتا تھا۔ علاوہ ازیں دوست بھی دے جایا کرتے تھے۔ ملک صاحب ہمیشہ اچھے لوگوں کو یاد رکھنے کی تلقین کیا کرتا تھا: ''کم از کم کچھ لوگوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔ بزنجو صاحب ہیں، شہزادہ عبدالکریم خان ہیں......ہمیں اپنے اچھے لوگوں کو گم نامی میں نہیں جانے دینا چاہیے۔ آپ کو لکھنا چاہیے، مجھے لکھنا چاہیے، مؤرخ کو لکھنا چاہیے''۔ وہ اپنے دوستوں کی بہت خوب صورت انداز میں درجہ بندی کرتا تھا۔ ''ملک عبدالرحیم خواجہ خیل اور غوث بخش بزنجو جیسے قائد بہت کم جماعتوں کے حصے میں آئے۔ بابو عبدالکریم، میر گل خان نصیر، میر حمل خان گوہرام زئی جیسے اچھے کارندے نہیں ملیں گے، تلّی کا رہنے والا نسیم بہت بڑا لکھنے والا تھا......''۔

ملک فیض محمد یوسف زئی اپنے سیاسی مرشد غوث بخش بزنجو کی طرح سیاسی کینسروں سے

لڑتے لڑتے کینسر کی بیماری کے ہاتھوں فوت ہوگیا۔سادہ سی بات کے لیے جیا،ایک گھمبیر مرض میں مرا۔خلوص،سچائی ، بھائی بندی ، رواداری کی فضا میں انسان دوستی کے لیے زندہ رہا اور منافقت ، جھوٹ ، دغا دھوکہ ،قتل ، لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی فضا میں دل برداشتگی اور مایوسی کو ٹھوکریں مارتے مارتے مرا۔

مستونگ کا ملنگ چل بسا ، ایک بڑا خلا پیدا کر کے ۔مستونگ جو سیاست کا گڑھ تھا۔ وہیں بلوچ ترقی پسند تحریک پیدا ہوئی ۔ وہیں نشو ونما پائی ۔ ملک صاحب اور اس کے دوستوں کی تحریک تاریخ کے تھپیڑوں کی نذر ہوکر ارتقا کی ایک نئی صورت میں ڈھل چکی ہے لیکن وہ خوش قسمت لوگ تھے جو باوقار جیے باوقار مرے۔وہ خوش قسمت لوگ تھے جنہوں نے تضادات کو پہچان لیا اور صحیح وقت پر صحیح عمل کیا۔ملک صاحب کی جوانی یعنی’’1920ء سے 1947ء کا دور بلوچوں کی سیاسی تحریک کا ابتدائی دور تھا‘‘۔(18) پھر انہیں زبردست کمٹ منٹ رکھنے والے رفقا ملے ،تحریک کہاں سے کہاں پہنچائی ان درویشوں نے۔ ملک صاحب نے اپنی یہ ساری داستان ایک کتاب کی شکل میں لکھ دی ۔اس کی سب سے بڑی آخری کوشش اس کتاب کی اشاعت تھی ۔ وہ جب بھی ملتا اُس کی آنکھوں سے یہ التجا نمایاں نظر آتی:’’میں نے تمہاری نسلوں کی آزادی آبادی کے لیے پوری عمر لگا دی، کیا تم صرف چند دن میری کتاب کی ترتیب پر صرف کرو گے؟‘‘۔اس کی کتاب پر میں نے کام بھی بہت کیا،ان کی ترتیب میں مدد بھی کی ۔اس سے کتاب کی کوتاہیوں خامیوں پر بحث بھی کی مگر یہ سب کچھ آدھا رہ گیا۔میری خواہش تھی کہ وہ کم از کم اپنی تصنیف کو چھپی ہوئی کتابی صورت میں اپنی زندگی میں دیکھ لے ۔مگر وہ یہ بوجھ زندوں کو تھما کر چلا گیا۔

وہ اور بھی کئی ذمہ داریاں دے گیا........... پتہ نہیں کتنے لوگوں کو ان غیر محسوس قرضہ جات کی ادائیگی کا احساس ہے!!

(بعد میں یہ کتاب بہت خوب صورت انداز میں، میں نے اپنی ہی تنظیم پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے چھاپ دی جو بہت مقبول ہوئی)۔

حوالہ جات

1۔ پیکولین/ شاہ محمد مری۔’’بلوچ‘‘۔صفحہ نمبر 61

2۔اے ہیوز۔’’دی کنٹری آف بلوچستان‘‘۔صفحہ نمبر 51

3۔ایضاً

4۔اے ہیوز۔’’دی کنٹری آف بلوچستان‘‘۔صفحہ نمبر 62

5۔بلوچستان گزیٹیئر۔صفحہ نمبر 163

6۔پیکولین/ شاہ محمد مری۔’’بلوچ‘‘۔صفحہ نمبر 152

7۔ایضاً۔صفحہ نمبر 149

8۔شمس گردی کی کاپی جو عبدالقادر رند کی لائبریری سے دستیاب ہوئی۔

9۔عطائی، محمد ابراہیم۔’’دبلوچو آزادی بخشو جنبشونو تہ یوہ کتنہ‘‘1984۔سوشل سائنسز سینٹر کابل۔ صفحہ نمبر 423

10۔ملک فیض محمد یوسفزئی، ’’بابائے استمان‘‘نوکین دور شمارہ 12،1995۔صفحہ نمبر 16

11۔نصیر، میر گل خان۔’’تاریخ بلوچستان‘‘ جلد دوئم۔صفحہ نمبر 348

12۔عطائی’’دبلوچو آزادی بخشو‘‘........صفحہ نمبر 46

13۔بلوچ، عنایت اللہ۔’’پرابلمز آف گریٹر بلوچستان‘‘غیر مطبوعہ مسودہ۔صفحہ نمبر 152

14۔مختصر تاریخ بلوچ و خوانین بلوچ۔صفحہ نمبر 160

15۔بلوچ، عنایت اللہ’’پرابلمز.........صفحہ نمبر 153

16۔بابو عبدالکریم کے ذخیرے سے دستیاب ہونے والی دستاویز

17۔پشتنو او بلوچو سیاسی کرونولوجی.........صفحہ نمبر 227

18۔نصیر، گل خان۔ بلوچی رزمیہ شاعری۔1979۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ نمبر 31